بسم اللہ الرحمن الرحیم

عدالتی بحران اور عدلیہ کی بالادستی

ابو عمار
زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

جملہ حقوق محفوظ!

کتاب : حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل
مصنف : ابوعمار زاہد الراشدی
مرتب : محمد عمار خان ناصر
ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ
اشاعت : فروری ۲۰۰۷ء

فہرست

اسٹیل ملز کیس پر عدالت کا فیصلہ اور حکومت کا ردعمل	۵
پاکستان اسٹیل ملز اور عدالت عظمیٰ	۱۰
فیصلے سے قبل ہی سزا	۱۶
نظریہ ضرورت اور ایڈہاک ازم کا خاتمہ ضروری ہے	۲۰
عدالتی بحران اور وکلاء برادری کی جدوجہد	۲۴
جسٹس افتخار محمد چودھری کا تاریخی خطاب	۲۸
چیف جسٹس کی بحالی اور قوم کی توقعات	۳۳
وکلاء تحریک کے قائدین کی خدمت میں چند معروضات	۳۸
عدلیہ کی بحالی اور دستور و قانون کی بالادستی	۴۲

اسٹیل ملز کیس پر عدالت کا فیصلہ اور حکومت کا ردعمل

پاکستان اسٹیل ملز کراچی کی نجکاری کے حوالہ سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلہ پر مختلف حلقوں کی طرف سے متنوع ردعمل کا اظہار کیا جارہا ہے۔ عام طور پر یہ فیصلہ لوگوں کی خوشی کا باعث بنا ہے اس حوالہ سے بھی کہ ملک کا ایک اہم اثاثہ اخباری رپورٹوں کے مطابق اونے اونے بکنے سے بچ گیا اور اس حوالہ سے بھی کہ عدالت عظمیٰ نے حکومت وقت کے خلاف ایک اہم فیصلہ دے کر اس تاثر کو کم کرنے کی کوشش کی ہے کہ حکومت ہماری اعلیٰ عدالتوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے میں اکثر کامیابی حاصل کرلیتی ہے۔ یہ تاثر صرف عام حلقوں کا ہی نہیں بلکہ ایک حالیہ انٹرویو میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب جسٹس سعید الزمان صدیقی نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کا کردار اور رویہ ناقابل رشک اور مایوس کن ہے اور اس قسم کی صورتحال نصف صدی قبل مولوی تمیز الدین کیس کے دور میں چلی آرہی ہے۔ کراچی کے ایک انگریزی جریدے ''ہیرالڈ'' کو دیئے گئے انٹرویو میں انہوں نے کہا ہے کہ ''ہماری بدنصیبی ہے کہ سویلین اور فوجی دونوں نوعیت کے حکمرانوں نے کبھی آزاد عدلیہ کا وجود پسند نہیں کیا اور اگر ۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل کی طرف سے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے اقدام کو فیڈرل کورٹ آف پاکستان جائز قرار نہ دیتی تو آج ملکی حالات مختلف اور بہتر ہوتے۔ اس پس منظر میں اسٹیل ملز کے بارے میں حکومتی موقف کے خلاف عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر عام لوگوں کو خوشی ہوئی ہے اور یہ توقع کی جانے لگی کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت خود پر حکومتی دباؤ کا تاثر ختم کرنے کی طرف چل پڑی

ہے‘‘۔سابق چیف جسٹس سیعد الزمان صدیقی نے بھی مذکورہ انٹرویو میں اس توقع کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ پاکستان اسٹیل ملز کیس پر عدالت عظمیٰ نے جو فیصلہ دیا ہے اس سے اصلاح احوال کی کچھ امیدیں بندھی ہیں۔

دوسری طرف پاکستان کے سابق وزیر قانون اور سابق اٹارنی جنرل جناب شریف الدین پیرزادہ نے ’’ہیرالڈ‘‘ کے مذکورہ شمارے کے لیے دئے گئے انٹرویو میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور اگرچہ وہ اس انٹرویو میں اعلیٰ عدالتوں پر حکومت کے دباؤ کی بات قبول کرنے سے ہچکچا رہے ہیں لیکن انہوں نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ ’’قیام پاکستان کے بعد ابتداء میں اعلیٰ عدلیہ کا کام ٹھیک چل رہا تھا اور خرابی ۱۹۵۴ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب چیف جسٹس پاکستان سر عبدالرشید کی ریٹائرمنٹ پر ان کا جانشین سب سے سنیئر جج جسٹس اکرم کو جن کا تعلق ڈھاکہ سے تھا نظر انداز کر کے مسٹر جسٹس محمد منیر کو براہ راست اس اعلیٰ ترین عہدے پر فائز کر دیا گیا۔یہ پاکستان کی تاریخ کا المناک ترین مرحلہ تھا، اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند نہ ہوئی اور جسٹس منیر نے بعض ایسی حرکات کیں جن سے نہ صرف جمہوریت کو بدترین نقصان پہنچا بلکہ پاکستان کی خودمختاری وسلمیت کو بھی دھچکہ لگا۔‘‘

جناب شریف الدین پیرزادہ کا کہنا ہے کہ چیف جسٹس محمد منیر کے بعض فیصلے بشمول مولوی تمیزالدین کیس بعدازاں بیگم نصرت بھٹو کیس سمیت کئی مقدموں پر اثر انداز ہوئے کیونکہ نصرت بھٹو کیس کے فیصلے نے جنرل ضیاءالحق کی بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کی کاروائی کی تائید کی اور پھر انہی فیصلوں کے نتیجے میں جنرل پرویز مشرف کی کاروائی کو بھی تائید حاصل ہوئی۔

اس کے ساتھ شریف الدین پیرزادہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسٹیل ملز کے بارے میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ سے اس کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے اور الزامات کے تاثر میں کمی ہوئی ہے۔پاکستان کی عدالت عظمیٰ سے اس بات پر کم وبیش سب حلقوں کا اتفاق پایا جاتا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں جب گورنر جنرل غلام محمد مرحوم نے دستور ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے خلاف مولوی تمیزالدین مرحوم دادرسی کے لیے عدالت عظمیٰ کے پاس گئے تو یہی وہ مرحلہ تھا، جب عدالتی کردار کی پہلی اینٹ ٹیڑھی ہوئی کیونکہ جسٹس محمد منیر نے فیڈرل کورٹ آف

پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے گورنر جنرل غلام محمد کے اس اقدام کو جائز قرار دے دیا اور اس قسم کے اقدامات کے لیے ''نظریہ ضرورت'' کی اصطلاح بھی سب سے پہلے انہوں نے استعمال کی۔ اس کے بعد اس ٹیڑھی اینٹ پر جو عمارت کھڑی کی گئی اس کی کجی ساری دنیا کو دکھائی دے رہی ہے اور دستوری حوالہ سے ہماری اعلیٰ ترین عدالت کا کردار فارسی کے مشہور شعر

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کا مصداق بن کر رہ گیا جس کا رونا شریف الدین پیرزادہ نے بھی اپنے انٹرویو میں رویا ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت تک جتنے انسان قتل ہوں گے ان سب کا بوجھ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل کے گردن پر بھی ہوگا اس لیے کہ سب سے پہلا انسان اس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور اس نے عورت کے چکر میں اپنے بھائی کو قتل کر کے دنیا میں انسانی خون بہانے کی اس رسم بد کا آغاز کیا تھا اس لیے پاکستان میں دستور اور جمہوریت کے جتنے قتل اب تک ہوئے ہیں اور جتنے خدانخواستہ آئندہ ہوتے رہیں گے ان کی ذمہ داری اس قتل کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ ساتھ جسٹس محمد منیر کی گردن پر بھی ہوگی کہ وطن عزیز میں انصاف، جمہوریت اور دستور کی بالادستی کا قتل سب سے پہلے انہی کے ہاتھوں ہوا۔ پاکستان کی بنیاد ہمیشہ اسلام اور جمہوریت کو قرار دیا جاتا رہا ہے اور اب بھی ملک کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' اور اس کا دستور اسلام اور جمہوریت کو ہی ملک کی اساس تسلیم کرتا ہے لیکن جس طرح جمہوریت کو ہماری اعلیٰ عدالت سے وہ شکایت ہے جس کا ذکر جناب شریف الدین پیرزادہ کے انٹرویو میں ہو چکا ہے اسی طرح اسلام بھی شکوہ کناں ہے کہ اس کے بارے میں جب عدالت عظمیٰ ایک فیصلہ کن مرحلہ پر آئی تو اس نے ملک کی نظریاتی اساس اور ملت اسلامیہ کے عقیدہ وایمان کو ترجیح دینے کی بجائے معروضی حالات کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنایا۔ میں اس کے لیے اس کیس کا حوالہ دینا چاہوں گا جس میں ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ دستور پاکستان میں ''قرارداد مقاصد'' کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر نظام حکومت چلانے کا پابند کیا گیا ہے۔ ایک دور میں قرارداد

مقاصد ملک کے دستور کا صرف دیباچہ ہوا کرتی تھی اور اسے دستور کا قابل عمل حصہ تصور نہیں کیا جاتا تھا مگر جنرل ضیاء الحق نے سپریم کورٹ کی طرف سے تفویض کردہ اختیارات کے تحت اسے دستور کا عملی حصہ بنا دیا تو ایک کیس میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ اگر دستور کی کوئی اور دفعہ قرارداد مقاصد سے متصادم ہو تو کیا قرارداد مقاصد کو ملک کی نظریاتی اساس کی علامت ہونے کی وجہ سے باقی دستور پر بالادستی حاصل ہوگی؟ ہمارے خیال میں جس طرح ۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی کی گورنر جنرل کی طرف سے برطرفی کے جواز یا عدم جواز کا سوال ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس میں جسٹس محمد منیر کے فیصلے نے جمہوریت کی گاڑی کو ہمیشہ کے لیے پہیے سے اتار دیا اسی طرح دستور پاکستان میں ''قرارداد مقاصد'' کی بالادستی کا یہ سوال ملک میں اسلامی نظام کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن مرحلہ تھا، اگر اس موقع پر عدالت عظمیٰ ''قرارداد مقاصد'' کی بالادستی کو تسلیم کر لیتی تو ملک میں اسلامی سپریم کورٹ کے نفاذ کے لیے خود عدالت عظمیٰ کے ذریعہ راہ ہموار ہو جاتی مگر سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ نے قرارداد مقاصد کی بالادستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے ملک کے اجتماعی نظام کے قرآن وسنت کی پٹڑی پر چلنے کا جو امکان پیدا ہو گیا تھا اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

تاریخ اور قانون کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے نزدیک ان دونوں فیصلوں کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک فیصلے نے جمہوریت کو سبوتاژ کر دیا اور دوسرے نے اسلام کے راستے میں دیوار کھڑی کر دی۔

اس طویل پس منظر کے تذکرہ کا مقصد دراصل اسٹیل ملز کے بارے میں عدالت عظمیٰ کے حالیہ فیصلے پر عوامی حلقوں کی خوشی کی اہمیت اور نوعیت کو واضح کرنا ہے کہ اس پس منظر اور ماحول میں جبکہ سابق چیف جسٹس جناب سعید الزمان صدیقی کے بقول ''عام آدمی کو عدالت پر کوئی اعتبار نہیں رہا'' ہماری عدالت عظمیٰ نے ملک کے اثاثوں کو بچانے کے لیے ایک تاریخی فیصلہ دیا ہے۔ اور اس میں حکومت کے موقف اور پالیسی کی پرواہ نہیں کی تو یہ بات بلاشبہ ملک کے عوام کے لیے انتہائی خوشی کا باعث اور مستقبل کے حوالہ سے بہت حوصلہ افزا ہے اور ہم اس پر چیف

جسٹس آف پاکستان محترم جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کے رفقا کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح عدالت عظمیٰ نے ملک کے مادی وسائل اور مالی اثاثوں کو بچانے کے لیے کردار ادا کیا ہے ملک کے نظریاتی اثاثوں اسلام اور جمہوریت کو بچانے اور انہیں یرغمالیوں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے بھی ملک کے عوام کو عدالت عظمیٰ سے ہی توقع ہے۔

البتہ جنرل پرویز مشرف کا ردعمل اس سے مختلف ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور میں ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء کو شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق صدر محترم نے اسٹیل ملز کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے دن کو پاکستان کے لیے ''یوم غم'' قرار دیا ہے اور اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ ''نجکاری ہماری اقتصادی حکمت عملی کا اہم حصہ ہے کیونکہ حکومت کا کام بزنس نہیں۔ جہاں بھی حکومت گھسی بیڑا غرق کیا۔ اسٹیل ملز، ریلوے، واپڈا، کے ای ایس سی، رائس ایکسپورٹ کارپوریشن، کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن سب ادارے خسارے میں چلے گئے۔ بینکوں کو لوگ لوٹ رہے تھے اور قرضے معاف کرا لیتے تھے، ہم نے جس سے جان چھڑائی اس کی حالت اچھی ہوگئی اور آج بینک بہترین کارکردگی دکھا رہے ہیں اس لیے نجکاری میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔''

صدر محترم کے اس ارشاد پر ہمیں کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ جس طرح جسٹس سعید الزمان صدیقی اور جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب کے ارشادات سے ہماری عدلیہ کے کردار کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے اسی طرح صدر جنرل پرویز مشرف کا یہ فرمان ہماری انتظامیہ کی کارکردگی کا بہترین میزان ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۱۸ر جولائی ۲۰۰۶ء)

پاکستان اسٹیل ملز اور عدالت عظمیٰ

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے پہلے جب ملک میں انتخابی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو وہ میری سیاسی اور خطابتی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز سے عقیدت زیادہ تھی اور اب بھی ہے۔ ان کی سیاسی جدوجہد اور سیاسی افکار سے سب سے زیادہ متاثر تھا اور اسی مناسبت سے استعمار دشمنی کی بات کسی طرف سے بھی ہو، اچھی لگتی تھی۔ جمعیت علماے اسلام کا اجتماعی ذوق بھی یہی تھا (جواب پس منظر میں چلا گیا ہے) اس حوالے سے لیفٹ کے سیاسی کارکنوں کے ساتھ ہمارا میل جول زیادہ رہتا تھا اور ہم مختلف معاملات میں ایک دوسرے کو سپورٹ بھی کیا کرتے تھے۔ امریکہ ہماری سیاسی گفتگو بلکہ تابڑتوڑ حملوں کا سب سے بڑا ہدف ہوتا تھا۔ اس وقت پاکستان میں امریکہ کے سفیر جوزف فارلینڈ کو ناپسندیدہ قرار دے کر واپس بھیجنے کا مطالبہ ہماری سیاسی تقریروں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ وہ امریکی امداد کی رقوم بالخصوص پی ایل ۴۸۰ کے فنڈ کو اپنی صوابدید کی بنیاد پر پاکستان کے سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر کے پاکستان کی قومی سیاست میں مداخلت کی راہ ہموار کر رہے ہیں اور اپنے استعماری شکنجے کو مضبوط بنانے میں مصروف ہیں۔

اس کے بعد دوسرا اہم موضوع پاکستان میں اسٹیل مل لگانے کا مطالبہ ہوتا تھا۔ ہم اپنی تقاریر اور بیانات میں اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ فولاد کسی بھی ملک کی صنعت اور دفاع دونوں کے حوالے سے بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بغیر نہ کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے دفاع میں خود کفیل ہو سکتا ہے۔ ہم اس پر قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ساتھ بین الاقوامی حالات اور اعداد و شمار سے دلائل

دیا کرتے تھے اور حکومت سے پرجوش مطالبہ کرتے تھے کہ فوری طور پر ملک میں فولادی صنعت کا اہتمام کیا جائے اور فولاد ڈھالنے کا کارخانہ لگا کر اس سمت میں پیش رفت کی جائے۔

پاکستان اسٹیل ملز کراچی کی نجکاری کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کا فیصلہ اور گزشتہ دنوں قومی اسمبلی میں اس سلسلہ میں ہونے والی بحث اخبارات میں نظر سے گزری تو یہ سارا منظر ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے گھوم گیا اور ۱۹۷۰ء سے قبل کی سیاسی گہما گہمی اور لیفٹ اور رائٹ کی کشمکش کے مناظر ذہن میں تازہ ہوگئے۔ پاکستان اسٹیل ملز کراچی میں میرا کافی عرصہ سے آنا جانا رہتا ہے۔ اسٹیل ملز کے ملازمین کی کالونی گلشن حدید کے فیز اکی جامع مسجد توحید میں ہمارے ایک محترم دوست مولانا احسان اللہ اشرف ہزاروی سالہا سال سے خطیب چلے آرہے ہیں۔ ہزارہ کے علاقہ بٹگرام سے تعلق رکھتے ہیں، جمعیت علماے اسلام کے سرگرم راہنماؤں میں سے ہیں، پاکستان شریعت کونسل کی سرگرمیوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ باذوق اور صاحب مطالعہ عالم دین ہیں، گزشتہ انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی ٹکٹ پر لانڈھی کے حلقہ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی اسمبلی میں اپنے حلقے کے عوام کے ساتھ ساتھ اہل دین کی بھی نمائندگی کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے سے بیمار ہیں، شوگر کی زیادتی نے آنکھوں کی بینائی کو خاصا متاثر کر دیا ہے اور اب وہ مطالعہ بلکہ از خود چلنے پھرنے سے بھی محروم ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمت کاملہ سے نوازے، آمین۔

ان کے ہاں اس سے قبل کئی بار حاضری ہوئی ہے۔ گزشتہ دنوں ۱۴ اگست کو میں ایک روز کے لیے کراچی گیا تو جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی کے جلسہ ختم بخاری میں حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کے ہاں مولانا احسان اللہ ہزاروی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ اسٹیل ملز کے بحران پر اس سے متعلقہ لوگوں سے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے ساتھ طے ہوا کہ ۲۱ اگست کو جامعۃ الرشید کے کلیۃ الشریعہ کے نصاب کے سلسلے میں ہونے والے دو روزہ سیمینار میں شرکت کے لیے میں نے حاضر ہونا ہے تو ایک روز پہلے آجاؤں گا اور رات اسٹیل ملز کے ملازمین کی کالونی گلشن حدید میں مولانا احسان اللہ ہزاروی کے ہاں قیام کروں گا، چنانچہ عزیزم حافظ عمار خان ناصر سلمہ مدیر ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ

کے ہمراہ میں نے بیس اگست کو رات ان کے ہاں قیام کیا اور انہوں نے کچھ متعلقہ دوستوں کے ساتھ ہماری ملاقات اور گفتگو کا اہتمام کر دیا جس میں وہ خود بھی شریک رہے اور ایک عوامی نمائندے کی حیثیت سے؟؟؟۔ اس موقع پر مختلف احباب سے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے مطابق اسٹیل ملز کراچی کے قیام اور اس کے موجودہ بحران تک پہنچنے کے حالات کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے:

پاکستان اسٹیل ملز کے قیام کا اصولی فیصلہ ۱۹۶۸ء میں ہو گیا تھا، لیکن اس کا سنگ بنیاد ۱۹۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے وزیر اعظم کی حیثیت سے رکھا۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں گراؤنڈ ورک کا آغاز ہوا اور ۱۹۸۱ء میں پہلے پیداواری یونٹ نے کام کا آغاز کیا۔ اسٹیل ملز کی مشینری سوویت یونین سے خریدی گئی۔ سوویت یونین نے اس مل کی تعمیر اور مشینری کی فٹنگ میں مسلسل تعاون کیا اور کئی سال تک سوویت یونین کے فنی ماہرین اور کاریگر ہزاروں کی تعداد میں مل میں کام کرتے رہے۔ اسٹیل ملز پر کل لاگت چوبیس ارب ستر کروڑ بتائی جاتی ہے جس میں گیارہ ارب کے لگ بھگ کے قریب رقم بینکوں سے قرض کے طور پر لی گئی جبکہ باقی رقم قومی خزانہ سے ادا کی گئی۔ اس طرح پاکستان اسٹیل ملز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسٹیل ملز کے لیے مخصوص کی گئی زمین کا رقبہ ساڑھے چار ہزار ایکڑ سے زیادہ بتایا جاتا ہے جس میں مشینری کم وبیش ایک ہزار ایکڑ کے دائرے میں نصب ہے اور باقی زمین خالی ہے۔

مئی ۲۰۰۰ء میں پاکستان اسٹیل ملز کی انتظامی و مالیاتی تنظیم نو کا فیصلہ ہوا تو بینکوں سے حاصل کردہ گیارہ ارب سے زیادہ رقم کو ملز کے ذمہ قرار دے کر اس کی ادائیگی ملز کے کھاتے میں ڈال دی گئی جبکہ دوسری طرف سے یہ موقف تھا کہ چونکہ حکومت پاکستان خود اس کی مالک ہے اور اس کا نفع نقصان اسی کے کھاتے میں ہے، اس لیے بینکوں سے بطور قرض حاصل کی گئی رقم سرمایہ کاری کی مد میں ہی شمار ہوتی ہے اور اسے مل کے ذمہ الگ قرض قرار دینا درست نہیں ہے، لیکن اس موقف کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی اور بینکوں کی رقم کو ملز کے ذمہ قرار دے دیا گیا۔ گیارہ ارب کی اس رقم پر اس وقت تک سات ارب کے لگ بھگ سود کی رقم کا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ رقم انیس ارب تئیس کروڑ کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ پاکستان اسٹیل ملز اس امر کی ذمہ دار قرار پائی کہ

وہ اس قرض کی سالانہ قسط دینے کے ساتھ ساتھ مجموعی رقم پر سود بھی ادا کرے گی جو تقریباً دو ارب روپے سالانہ بنتا تھا۔ اپنی سالانہ آمدنی میں سے قرض کی قسط اور سود کی رقم کی ادائیگی کے بعد اسٹیل ملز خسارے پر چلنے والی صنعت شمار ہونے لگی تو ایک معاہدے کے تحت اسٹیل ملز کو پابند کر دیا گیا کہ وہ ۲۰۱۹ء تک اس قرضے کو بہر حال ادا کرے گی۔

اس کے ساتھ ہی ملز کے اخراجات کو کم کرنے کے لیے ملازمین میں تخفیف کا فیصلہ کیا گیا۔ بائیس ہزار سے زائد باقاعدہ ملازمین کو پندرہ ہزار کے دائرے میں لانے کے لیے گولڈن ہینڈ شیک کی اسکیم اختیار کی گئی جس کے تحت آٹھ ہزار کے لگ بھگ ملازمین فارغ ہوئے اور ملز نے انہیں اس اسکیم کے تحت ساڑھے چار؟؟ کے لگ بھگ رقم ادا کی۔ ملز کے ملازمین کا کہنا ہے کہ اس وقت تک مل منافع میں چل رہی تھی، لیکن قرضوں اور سود در سود کی ادائیگی کی اس ذمہ داری کے بعد وہ منافع بخش نہ رہی تو ۱۹۹۷ء میں اسے نجی شعبے میں فروخت کرنے کا اصولی فیصلہ کر لیا گیا، مگر یہ فیصلہ کاغذات کی حد تک رہا، جبکہ حکومت کی عملی پالیسی ملز کے دائرہ کار میں وسعت کی رہی، اس لیے نجکاری کا یہ فیصلہ حکومت کی اس حکمت عملی کے باعث لوگوں کے ذہنوں سے اتر گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ پاکستان میں اسٹیل کی مجموعی ضرورت پچاس لاکھ ٹن ہے، جبکہ پاکستان اسٹیل ملز کی پیداواری صلاحیت گیارہ لاکھ ٹن ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنے دور حکومت کے آغاز میں روس کی حکومت سے معاہدہ کیا کہ روس کے تعاون سے اس صلاحیت کو فوری طور پر پندرہ لاکھ ٹن تک بڑھایا جائے گا اور بعد میں اسے تیس لاکھ ٹن تک لے جایا جائے گا۔ اس کے بعد وزیر اعظم جناب شوکت عزیز نے چین کی حکومت سے پاکستان اسٹیل ملز میں توسیع کے لیے بات چیت کی جس پر چینی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے ۸۰ فیصد رقم فراہم کرنے کے لیے تیار ہے اور اگر باقی بیس فی صد کے لیے حکومت پاکستان دقت محسوس کرتی ہے تو اس پر بھی غور کیا جا سکتا ہے، مگر کم و بیش تمام معاملات طے پانے کے بعد جب عملی معاہدہ کی نوبت آئی تو حکومت پاکستان نے قدم پیچھے ہٹا لیا۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان اسٹیل ملز کی نجکاری کے لیے تیز رفتاری کے ساتھ کام شروع کر

دیا گیا۔ نجکاری کا فیصلہ کرنے کے لیے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو توڑ کر نیا بورڈ بنایا گیا، بڑی عجلت میں اس کا اجلاس اسلام آباد میں وزیراعظم جناب شوکت عزیز کی صدارت میں ہوا، اس میں پاکستان اسٹیل ملز کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا اور نجکاری کمیشن نے اپنا کام تیزی کے ساتھ شروع کردیا۔ اسٹیل ملز کی قیمت طے کرنے کے لیے بین الاقوامی فرم ''سٹی گروپ'' کو ایڈوائزر مقرر کیا گیا جس نے مبینہ طور پر پاکستان اسٹیل ملز، اس کی مشینری اور اثاثوں کی ''مارکیٹ ویلیو'' دیکھنے اور تعین کرنے کی بجائے ''بک ویلیو'' کے اصول پر اس کی قیمت طے کی اور ایک کنسورشیم نے جس کے ۴۰ فی صد مالک سعودی، ۱۰ فی روسی اور ۲۰ فی صد پاکستانی بتائے جاتے ہیں، ساڑھے اکیس ارب روپے میں اسے خرید لیا۔ ملازمین میں پیپلز ورکرز یونین نے اور ایک اور گروپ وطن پارٹی نے اسے عدالت میں چیلنج کردیا جس کا موقف یہ تھا کہ:

☆ پاکستان اسٹیل ملز کو فروخت کرنے میں جلد بازی کی گئی ہے اور بہت سے قانونی تقاضوں کو نظرانداز کردیا گیا ہے۔

☆ اس کی قیمت ''مارکیٹ ویلیو'' کے معروف اصول پر طے کرنے کی بجائے ''بک ویلیو'' کے طریق کار پر لگائی گئی ہے جو اس کی مارکیٹ قیمت سے بہت زیادہ کم ہے، بلکہ مفت خریداروں کے سپرد کردینے کے مترادف ہے۔

☆ سودے میں ملز کی جو زمین شامل کی گئی ہے، اس کی قیمت سرے سے لگائی ہی نہیں گئی۔

☆ جس تاریخ کو ملز کی فروخت مکمل ہوئی، ملز کے پاس ساڑھے بارہ ارب کا خام مال اور تیارشدہ مال موجود تھا، اس کے پاس ساڑھے آٹھ ارب روپے نقد موجود تھے اور زائد ادا کیے گئے ٹیکسوں میں سے قانون کے مطابق اسے ایک ارب روپے واپس ملنے تھے۔ اس طرح پاکستان اسٹیل ملز خریدنے والوں کو ساڑھے اکیس ارب روپے کی رقم اس صورت میں جوں کی توں واپس مل جانا تھی اور یہ اسٹیل ملز ہزاروں ایکڑ زمین اور اربوں روپے کی مشینری سمیت انہیں بالکل مفت ملنا تھی جس پر ملک کی عدالت عظمیٰ نے بروقت نوٹس لیا اور وہ تاریخی فیصلہ صادر کیا جو اس وقت ملک کے اعلیٰ ایوانوں میں زیر بحث ہے اور جس پر ملک کے محبِّ وطن حلقے اور عوام سپریم

کورٹ آف پاکستان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔

پاکستان اسٹیل ملز کے جن حضرات سے ہماری ملاقات ہوئی، ان کے بقول حکومت پاکستان نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ پاکستان اسٹیل ملز خریداروں کے سپرد کرتے وقت وہ موجودہ ملازمین کو فارغ کرنے کے لیے پندرہ ارب روپے اپنی طرف سے ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس طرح ملز کی ساڑھے اکیس ارب روپے کی رقم میں سے یہ پندرہ ارب روپے نکال کر قومی خزانہ کو اس میں سے صرف ساڑھے چھ ارب روپے ملنا تھے۔

ان دوستوں نے ہمیں اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات بتائی کہ اگرچہ اسٹیل ملز نے بینکوں سے قرضہ ایک معاہدے کے تحت ۲۰۱۹ء تک واپس کرنا تھا، لیکن ملز یہ سارا قرض واپس کر چکی ہے، البتہ جب ملز نے تیز رفتاری کے ساتھ قرضہ واپس کرنا شروع کیا تو بینکوں نے اپنا قرضہ واپس لینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اس سودی رقم سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے جو انہیں اس قرضے کی رقم پر ۲۰۱۹ء تک مسلسل حاصل ہونی تھی، چنانچہ حکومت کو اس مسئلہ میں مداخلت کرنا پڑی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگرچہ مشترکہ مفادات کی کونسل نے پاکستان اسٹیل ملز کی دوبارہ نجکاری کا فیصلہ کر لیا ہے، لیکن وزیر اعلیٰ سرحد اکرم خان درانی نے اس فیصلے سے اختلاف کر کے پاکستان کے کروڑوں عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اگر وہ اپنے اس فیصلہ کو مزید قانونی پیش رفت کی شکل دے سکیں تو ملک کے اس عظیم اثاثے کو اونے پونے فروخت ہونے سے روکا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ اگر اس فیصلے کو باضابطہ چیلنج کر دیں تو نجکاری کا یہ فیصلہ پارلیمنٹ کے مشترکہ فورم کے پاس چلا جائے گا اور پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے منظوری حاصل کیے بغیر پاکستان اسٹیل ملز کو قانونی طور پر فروخت نہیں کیا جا سکے گا۔ خدا جانے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ جناب محمد اکرم خان درانی ''چہ ارزاں فروختند'' کے اس عمل کو روکنے کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں؟

(روزنامہ پاکستان، ۲۶ اگست ۲۰۰۶ء)

فیصلے سے قبل ہی سزا

جسٹس افتخار محمد چودھری نے جب اسٹیل ملز کی پرائیویٹائزیشن کے حوالے سے فیصلہ دیا تھا تو یہ خدشہ اسی وقت سے ذہن پر منڈلانے لگا تھا کہ ''کچھ ضرور ہوگا''۔ پھر جب پتنگ بازی کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا فیصلہ سامنے آیا تو خدشے کا دائرہ وسیع ہونے لگا، جبکہ بہت سے دیگر کیسوں میں چیف جسٹس کے برق رفتار فیصلوں نے بھی اس خدشے کو خطرے کا روپ دینے میں اہم کردار ادا کیا، لیکن سچی بات ہے کہ اس صورت حال کا ذہن کے کسی گوشے میں وہم وگمان بھی نہ تھا جس کا ملک کی عدالت عظمیٰ کے سربراہ کو سامنا کرنا پڑا اور جس نے پوری قوم کو ششدر کر کے رکھ دیا ہے۔ آج ہی لندن سے ایک بزرگ دوست کا فون آیا جن کا تعلق انڈیا سے ہے، وہ مجھ سے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ میں نے ان سے گزارش کی کہ ہم تو ''ہوسکتا ہے'' کے مرحلے سے بہت آگے جا پہنچے ہیں۔

جہاں تک چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف جاری کی جانے والی ''فرد جرم'' کا تعلق ہے، اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں فیصلے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکے گا، لیکن اس سے ہٹ کر آج سارا دن دو تین سوال میرے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ ایک یہ کہ اگر اس ''چارج شیٹ'' میں درج سارے الزامات درست ثابت ہو جائیں تو بھی کیا ان کی سزا وہی ہے جو دی جارہی ہے، بلکہ اب تک دی جا چکی ہے؟ اس لیے کہ کسی جرم کی سزا کے تعین میں صرف جرم کی نوعیت نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اس ماحول کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے جس میں اس جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ ماحول کسی جرم کی سنگینی اور سطح کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور شاید اس معروف مسیحی روایت کا پس منظر بھی یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے سامنے بدکاری کا ایک مجرم لایا

گیا جس کی سزا موسوی شریعت میں سنگسار کرنا تھی۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ اسے شریعت کے قانون کے مطابق سنگسار کر دیا جائے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: ٹھیک ہے، اس کو یہی سزا دی جائے لیکن اسے سنگسار کرنے لیے پہلا پتھر وہ شخص اٹھائے جس نے زندگی میں خود کبھی بدکاری نہ کی ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اور سزا کا مطالبہ کرنے والا ہجوم رفتہ رفتہ خود ہی چھٹ گیا تھا۔

دوسرا سوال جس نے گزشتہ دو دنوں سے میرے ذہن کو پریشان کر رکھا ہے کہ کیا کسی پر فرد جرم عائد کرنے، الزامات لگانے اور پھر سزا دینے کا طریقہ کار وہی ہوتا ہے جو ملک کی عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے؟ ابھی تو ٹرائیل نہیں ہوا، جرم ثابت نہیں ہوا، سزا کا تعین نہیں ہوا، جبکہ سزا پہلے ہی دے دی گئی ہے اور سزا بھی ایسی کہ اس سطح کے ''ملزم'' کے لیے جرم ثابت ہونے کے بعد اس سے زیادہ کسی سزا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس سٹیٹس کے لوگوں کے لیے تذلیل سے بڑی اور کون سی سزا ہو سکتی ہے اور اہانت سے زیادہ اور کس سلوک کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی سپریم کورٹ میں اس نکتے پر بحث ہو چکی ہے کہ کسی مجرم کو جرم ثابت ہونے کے بعد بھی کھلے بندوں سزا نہیں دی جا سکتی، اس لیے کہ اس سے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے اور انسانی عزت و شرف کا احترام، انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹر کی رو سے ہماری دستوری اور قانونی ذمہ داری ہے۔ اگر قانون کی دنیا کے لوگوں کو یاد ہو کہ قتل اور ڈکیتی کے کسی کیس میں ایک خصوصی عدالت نے مجرم کو کھلے بندوں پھانسی پر لٹکانے کا حکم صادر کیا تھا جس میں ''کھلے بندوں'' سزا دینے کا پہلو عدالت عظمیٰ میں چیلنج ہو گیا تھا اور اس پر ملک کے نامور قانون دانوں کے ساتھ ساتھ ملک کے اٹارنی جنرل اور چاروں صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرل بھی اس نکتے کی وضاحت کے لیے عدالت عظمیٰ میں پیش ہوئے تھے کہ کھلے بندوں سزا دینا عزت نفس کے منافی ہے جو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مترادف ہے، چنانچہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، عدالت عظمیٰ نے اس اصول کو تسلیم کرتے ہوئے ماتحت عدالت کا فیصلہ تبدیل کر دیا تھا، لیکن اب اسی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو الزامات کی ایک فہرست پر فیصلہ سنائے جانے سے پہلے بلکہ ٹرائیل سے بھی پہلے پوری دنیا کے سامنے سزا دی گئی ہے اور اس کی عزت و

احترام کے تمام تمغے اتار کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے گئے ہیں۔

عرصہ ہوا کہ ایک افیمی کا لطیفہ سنا تھا۔ کہتے ہیں کہ افیم کھانے والوں کو اکثر قبض کی شکایت رہتی ہے۔ وہ افیمی بھی قبض کا مریض تھا، جبکہ اس کے لوٹے میں سوراخ تھا۔ جب قضائے حاجت کے لیے بیٹھتا تو اس کے فارغ ہونے سے پہلے لوٹا پانی سے فارغ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ تنگ آ گیا کہ جب فارغ ہو کر استنجا کے لیے پانی کی ضرورت پڑتی ہیں تو لوٹا خالی ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک دن اس نے اس کا یہ حل نکالا کہ قضائے حاجت کے لیے بیٹھتے ہی پہلے استنجا کر لیا اور لوٹے سے مخاطب ہو کر بولا کہ لے میں نے اپنا یہ کام پہلے ہی کر لیا ہے، اب تجھ سے جو ہو سکتا کر لے۔ ہمارے مہربانوں نے بھی شاید یہی سوچا ہے کہ الزامات کی انکوائری، جرم کے ثبوت اور سزا کے تعین کا مرحلہ تو بہت طویل ہے، اس زلف کے سر ہونے تک کون جیتا ہے، اس لیے جو سزا دی جا سکتی ہے، وہ تو دے دی جائے، الزامات خود بخود ثابت ہوتے رہیں گے۔

میرے ذہن کی محدود سی اسکرین دو تین روز سے اس ''وسیع منظر'' کو اپنے تنگ دائرے میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے کہ ملک کی عدالت عظمیٰ کا چیف جسٹس ہے جو صدر کے کیمپ آفس اس کے روبرو بیٹھا اپنی صفائی پیش کر رہا ہے اور اس کے مطمئن نہ ہونے پر جب اپنے گھر پہنچا ہے تو وہ اپنے چیف جسٹس کے ''اسٹیٹس اور پروٹوکول'' سے محروم ہو چکا ہے، اس کے گھر پر پہرا لگ گیا ہے، اس کے خاندان کی ناکہ بندی ہو گئی ہے، ٹیلی فون کٹ گئے ہیں اور اس سے کسی کا ملنا ''شجر ممنوعہ'' قرار پا چکا ہے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ میرے ذہن کی جھلملاتی سکرین اس منظر کو کیچ کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو رہی کہ چیف جسٹس کی رہائش گاہ ہے اور اس سے ملنے کے لیے ایک حاضر سروس جسٹس باہر کھڑا ہے، مگر درمیان میں ایک ادنیٰ درجے کا پولیس افسر حائل ہے، اس لیے کہ جسٹس کو اپنے چیف جسٹس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ شاید بیداری کے عالم میں نہیں ہوں اور کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن جب اردگرد چاروں طرف حرکت کرتی دنیا کو دیکھتا ہوں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ خواب نہیں بیداری کا ماحول ہے جو کسی خوفناک خواب سے زیادہ بھیانک روپ اختیار کر چکا ہے۔ سزا تو دی جا چکی اور پوری دنیا نے اس کا تماشا بھی دیکھ لیا۔ کیا ملک کی سب سے بڑی عدالت کے سب

سے بڑے افسر کے لیے مزید کسی سزا کی گنجائش باقی رہ گئی ہے؟

تیسرا سوال جو ذہن کے نہاں خانے میں مسلسل کلبلائے جا رہا ہے، یہ ہے کہ یہ صورت حال اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے علاوہ کسی اور ملک میں پیش آتی تو کیا ہوتا؟ مغربی ممالک کو تو چھوڑیے کہ وہاں عدالت کا تصور ہی حکمرانوں کے اوسان خطا کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ کیا تیسری دنیا کے کسی ترقی پذیر، بلکہ غریب ممالک میں سے کسی ملک میں، جہاں ہماری طرح آمریتوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، کیا ملک کی عدالت عظمیٰ اور اس کے سربراہ کے ساتھ اس قسم کے طرز عمل کا سوچا جا سکتا ہے؟ سوالات تو اور بھی بہت سے ہیں جن پر سپریم جوڈیشل کونسل کا فیصلہ آنے کے بعد ہی کچھ عرض کیا جا سکے گا، مگر کوئی دانشور دوست سر دست ان دو تین سوالات کے حوالے سے ہی کچھ رہنمائی فرما سکیں تو ان کا بے حد کرم ہوگا۔

(روزنامہ پاکستان ۱۶/ مارچ ۲۰۰۷ء)

نظریہ ضرورت اور ایڈہاک ازم کا خاتمہ ضروری ہے

چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کے معاملے نے اس قدر حیران و ششدر کر دیا کہ کئی بار قلم اٹھانے کے باوجود اپنے اس کالم کے لیے کچھ نہ لکھ سکا اور یہ زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور میں اپنے ہفتہ وار کالم ''نوائے قلم'' کے لیے ایک مختصر سا مضمون لکھنے کے بعد قلم کو بریک سی لگ گئی اور بمشکل آج ذہن کو آمادہ کر پا رہا ہوں کہ اس کے بارے میں پھر قلم اٹھاؤں اور جو کچھ سامنے آ چکا ہے، اس کے بارے میں کچھ معروضات قارئین کی خدمت میں پیش کر دوں۔

جسٹس افتخار محمد چودھری نے جس انداز سے عدالت عظمیٰ کی سربراہی کے منصب پر اپنی کارکردگی کو آگے بڑھایا، اس کے بارے میں کئی بار دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ انہیں کسی آزمایش سے بچا لیں، مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے اور بہتری بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں ہوتی ہے کہ جس بات میں بظاہر شر ہی شر دکھائی دے رہا ہوتا ہے، اس میں کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔

جسٹس افتخار محمد چودھری کے بہت سے فیصلوں سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ ہر فیصلہ اپنی آزادانہ مرضی اور رائے سے کرتے ہیں اور عوامی تاثر یہ بن چکا ہے کہ ان کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن کسی طرح بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ یا وقتی مصلحت کی خاطر کیا ہے۔ پاکستان کی عدلیہ کے بارے میں ہر محبّ وطن پاکستانی کی یہ آرزو چلی آ رہی ہے کہ وہ اس مقام پر فائز ہو کہ اس کے فیصلوں کی آزادانہ حیثیت کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہ کیا جا سکے۔ ہمارے بہت سے جج صاحبان نے اس سلسلے میں شاندار

روایات قائم کی ہیں جو عدلیہ کی تاریخ میں ہمیشہ سنگ میل رہیں گی اور بہت سے جسٹس صاحبان نے یہ کیا کہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ عدلیہ کے لیے باہر سے درآمد کیے گئے سسٹم کے ساتھ نہیں چل سکیں گے تو انہوں نے خاموشی کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کرلی اور اس کام کے لیے خود کو پیش نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود یہ صورت حال بھی قوم کے سامنے ہے کہ جب بھی کوئی طالع آزما جبر اور قوت کے بل پر آگے بڑھا ہے اور اس نے دستور و جمہوریت کی بساط لپیٹ کر قوم کے وسیع تر مفاد کو اپنے اختیار و جبر کے ساتھ وابستہ کرلیا تو اسے ہماری محترم عدلیہ سے اس جواز کا سرٹیفکیٹ لینے میں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آئی اور ''نظریہ ضرورت'' کے تقاضے اس قدر وسعت اختیار کرتے گئے ہیں کہ دستور و جمہوریت کا معیار و تصور بھی اس کے سانچے میں ڈھلتا چلا گیا ہے اور آج قومی زندگی کا ہر شعبہ

ککرتے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

کا منظر پیش کر رہا ہے جس کا اردو میں ترجمہ کچھ اس طرح ہے کہ جب آپ انگور کے بیلوں کو پھیلانے کے لیے کیکر کے درخت پر چڑھا دیں گے تو کوئی گچھا بھی زخمی ہونے سے محفوظ نہیں رہے گا۔ آج ہماری پوری کی پوری قومی زندگی نظریہ ضرورت اور ایڈہاک ازم کے کیکر پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کا ہر گچھا زخموں سے چور کراہ رہا ہے۔

پاکستان کے بیوروکریٹ آمر غلام محمد کو دستور ساز اسمبلی توڑ دینے پر ہماری فیڈرل کورٹ نے سند جواز فراہم کی تو یہ سند جواز ہمیشہ کے لیے روایت بن گئی اور اس کے بعد اب تک جس آمر نے بھی دستوری عمل اور دستوری اداروں کو کراس کرنے کے لیے یہ سند مانگی ہے، اسے نظریہ ضرورت کے تحت کسی دقت کے بغیر ملتی چلی گئی ہے۔ اگر آج کے عدالتی بحران کے اسباب وعوامل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو اس کا شجرۂ نسب جسٹس محمد منیر کے اس فیصلے سے جا ملے گا جس نے نہ صرف عدلیہ اور مقنّنہ جیسے دو بڑے قومی اداروں کی دیواروں کے نیچے ڈائنا میٹ فٹ کر دیا بلکہ ایک اور ادارے کو درمیان میں گھس آنے کا راستہ بھی دکھایا جس کا ان اداروں کے ساتھ کوئی عملی واسطہ نہ تھا لیکن اگر کسی کو راستہ نظر آتا ہو بلکہ خود گھر میں گھس آنے کا راستہ دکھانے والے بھی موجود ہوں اور آنے والے کے پاس طاقت وقوت بھی ہو تو آنے والے

کو کون روک سکتا ہے؟ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا ہے اور ہم اس کے زخم چاٹنے اور مزید زخموں کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔

پاکستان کا قیام اسلام اور جمہوریت کے عنوان سے وجود میں آیا تھا جس کے لیے یہ اصول پیش کیا گیا کہ پاکستان میں حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کی ہوگی جو قرآن وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے نظام حکومت چلائیں گے۔ اس اصول پر ملک کے تمام طبقوں نے اتفاق کیا اور سیاسی و دینی جماعتیں بھی اس کے لے شانہ بشانہ ہوگئیں لیکن جب بھی ملک میں اسلام یا جمہوریت کی بالادستی کے تعین کے لیے فیصلہ کن وقت آیا، ایڈہاک ازم اور نظریہ ضرورت کی ریڈلائن نے راستہ روک دیا۔ ہمارے نزدیک دستور ساز اسمبلی توڑنے کے لیے نظریہ ضرورت کے تحت جسٹس محمد منیر کی طرف سے سند جواز فراہم کیا جانا اور دستور پاکستان کی باقی دفعات پر قرارداد مقاصد کی برتری کو تسلیم کرنے سے جسٹس نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ کا انکار، دونوں ایک ہی طرح کے فیصلے ہیں۔ ایک نے جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیا اور دوسرے فیصلے نے ملک کے دستوری وقانونی معاملات پر اسلامی اصولوں کی عملی بالادستی کو بریک لگادی اور ہم کولہو کے بیل کی طرح ایک آمر سے نجات حاصل کرنے اور دوسرے کا انتظار کرنے کے ایک ہی دائرے میں چکر کاٹتے چلے جارہے ہیں۔

اس پس منظر میں جسٹس افتخار محمد چودھری کے فیصلوں نے کچھ ڈھارس بندھائی اور امید کی ایک کرن نظر آنے لگی کہ قومی زندگی کے گرد ایڈہاک ازم اور نظریہ ضرورت کی ریڈلائنوں کا حصار شاید مدھم پڑنے لگا ہے۔ پاکستان اسٹیل ملز کے بارے میں ان کے فیصلے نے مستقبل کے بارے میں امید کے کئی چراغ روشن کردیے اور ملک کے عام شہریوں کی مشکلات اور حقوق کے حوالہ سے ان کے ازخود نوٹس لینے کی پالیسی نے عوام کے اس احساس کو زندہ کیا کہ ہمارے عدالتی سسٹم میں ان کی دادرسی کے امکانات بھی موجود ہیں۔

جہاں تک جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف دائر کیے گئے ریفرنس اور اس میں الزامات کی فہرست کا تعلق ہے، یہ معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل کے سپرد ہے اور وہی اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ حکومت کے پاس اگر اپنے چیف جسٹس کے خلاف شکایات اور

الزامات موجود ہیں تو انہیں سپریم جوڈیشل کونسل تک لے جانا حکومت کا حق ہے اور جسٹس افتخار محمد چودھری خود کو ان الزامات سے بری الذمہ سمجھتے ہیں تو کونسل میں اپنا دفاع کرنا اور اس بات کو غلط ثابت کرنا ان کا حق ہے۔ یہ بات اگر اسی دائرے میں آگے بڑھتی تو کسی شخص کو شکایت کا کوئی حق حاصل نہیں تھا لیکن انتظامی اور حکومتی سطح پر اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے اور ملک کے عوام نے اس کے جو مناظر میڈیا کے ذریعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، وہ اس قدر مکروہ اور بھونڈے ہیں کہ ہر شریف شہری چیخ اٹھا ہے۔ اس نے ملک بھر کی وکلاء برادری کو سڑکوں پر لا کھڑا کیا ہے اور ملک کی دینی و سیاسی جماعتیں بھی اس میں ان کی ہم آواز ہیں۔ ہمارے خیال میں اس معاملہ کا سب سے زیادہ روشن پہلو یہی ہے کہ عدلیہ کی آزادی، بالادستی اور وقار و احترام کے احساس نے دلوں میں کروٹ لی ہے اور یہ جذبہ بیدار ہو رہا ہے کہ قومی اداروں میں سے کسی ایک ادارے کو تو اس کے جائز مقام پر رکھا جائے، امید کی کسی ایک کرن کو تو باقی رہنے دیا جائے اور عدل و انصاف کے کسی ایک معیار کو تو مزید نیچے گرنے سے روک دیا جائے۔

ضروری نہیں کہ ہمیں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی ہر بات سے اتفاق ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم وکلاء برادری کے تمام مطالبات سے متفق ہوں، لیکن جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے متعدد فیصلوں اور پھر مستعفی ہونے سے انکار کے ذریعے ایک باوقار اور باکردار جج کا جو تصور زندہ کیا ہے اور ملک بھر کی قانون دان برادری جس طرح ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی ہے، ہم اس پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انہیں عدلیہ کی بالادستی اور احترام کے تحفظ کی اس جدوجہد میں کامیابی سے ہمکنار کریں، آمین یا رب العالمین۔ باقی رہیں ہماری شکایات تو ان کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا اور ان کے اظہار میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم کوئی جائز موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۶ مارچ ۲۰۰۷ء)

عدالتی بحران اور وکلاء برادری کی جدوجہد

سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس محترم جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر ہونے کے بعد سے ملک میں عدالتی بحران کی جو کیفیت پیدا ہوگئی ہے، اس سے ہر محبِّ وطن شہری پریشان اور مضطرب ہے اور عالمی سطح پر بھی وطن عزیز کے لیے جگ ہنسائی کی افسوس ناک صورت حال سامنے آئی ہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف پیش کی جانے والی شکایات کو اگر نارمل طریقے سے سپریم جوڈیشل کونسل میں لایا جاتا اور اس کے ساتھ انھیں دستور کے مطابق جبری رخصت پر بھی بھیج دیا جاتا تو یہ ایک معمولی کی کارروائی سمجھی جاتی اور بعض حلقوں کے تحفظات کے باوجود بحران کا یہ منظر نمودار نہ ہوتا، لیکن اس کارروائی کا آغاز جس طریقے سے ہوا اور وہ جس قسم کے مراحل سے گزر کر آگے بڑھی، اس نے شکوک وشبہات اور اعتراضات وخدشات کا بازار گرم کر دیا جس سے ملک کے قانون دان طبقے کا مضطرب ہو کر سڑکوں پر آنا تو ایک فطری امر تھا ہی، دیگر قومی حلقوں نے بھی اس کی سنگینی کو محسوس کیا اور بہت سے سیاسی و دینی حلقے وکلاء برادری کے ساتھ ہم آواز ہو گئے ہیں۔

جو کچھ ہوا اور جس طریقے سے ہوا، وہ سب کے سامنے ہے اور اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ بہت ہی غلط انداز سے ہوا اور اس پر ملک بھر میں جس اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا جا رہا ہے، وہ نہ صرف جائز اور روا ہے بلکہ ہمارے خیال میں اصل ضرورت سے بہت کم ہے، اس لیے کہ عدلیہ، ریاست کا ایک ایسا محترم ستون ہے جس کا احترام ہر حال میں قائم رہنا ناگزیر ہے۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں قومی اداروں کو وہ مقام اور حیثیت حاصل نہیں ہے جو ان کا جائز حق ہے اور جو قومی زندگی میں

اعتدال وتوازن، ملکی سالمیت، قومی وحدت اور ملی تشخص کے لیے ضروری ہے۔ عدلیہ کا مقام ان سب میں بالا ہے، اس لیے کہ دیگر قومی شعبوں اور اداروں میں توازن قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی بنیادی طور پر اسی کے پاس ہے، اس لیے اگر عدلیہ ہی خدانخواستہ بے وقار ہو جائے اور اس کی شخصیات کا احترام معروف حوالوں سے باقی نہ رہے تو دیگر قومی اداروں کے جائز مقام کے تحفظ کا اعتماد بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

جہاں تک چیف جسٹس کے خلاف شکایات اور الزامات کا تعلق ہے، یہ حکومت کا حق ہے کہ وہ ان الزامات کو سپریم جوڈیشل کونسل کے سامنے لائے اور جسٹس چودھری کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود کو ان الزامات سے بری ثابت کریں، ورنہ اس کے دستوری اور قانونی نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ ہم ان الزامات اور ان کے حوالے سے سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کیونکہ اس کے بارے میں کونسل ہی فیصلے کی مجاز ہے، لیکن اس سے ہٹ کر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے ساتھ حکومتی سطح پر جو سلوک روا رکھا گیا ہے، اس پر وکلاء برادری اور قومی حلقوں کے احتجاج میں ہم پورے طور پر شریک ہیں اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ عوامی جذبات اور قانون دان حلقوں کے احساسات کی پاسداری کرتے ہوئے عدلیہ اور اس سے متعلقہ شخصیات کے وقار کی بحالی کے لیے ضروری اقدامات بروئے کار لائے اور وکلاء کے مطالبات کو منظور کرے۔

اس کے ساتھ ہی ہم اس معاملے کے دو پہلوؤں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ عدلیہ کے تمام تر احترام اور اس کی ہر ممکن پاسداری کو ناگزیر قرار دینے کے باوجود موجودہ افسوس ناک صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو اس کے اسباب وعوامل میں خود عدلیہ کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دستور کی بالادستی اور دستوری اداروں کے احترام کو اب تک جس اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے اور جس کا تسلسل بدستور موجود ہے، اس سب کچھ نے ہمارے خیال میں جسٹس محمد منیر مرحوم کے اس فیصلے کی کوکھ سے جنم لیا ہے جو صرف گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کے کام نہیں آیا تھا، بلکہ اس کے بعد بھی ہر آمر اور طالع آزما کی مہم جوئی کو دستوری جواز فراہم کرنے کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے۔ اگر جسٹس محمد منیر مرحوم یہ متنازعہ فیصلہ نہ

دیتے اور ان کے بعد اسی فیصلے کے تسلسل کو ''نظریہ ضرورت'' کے عنوان کے تحت ہر دور میں قائم نہ رکھا جاتا تو آج خود عدالت عظمیٰ کو اس افسوس ناک بحران سے دوچار نہ ہونا پڑتا اور جو کچھ ہوا ہے، اس کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا۔ اس لیے ہم بصد ادب و احترام قانون دان برادری کے دونوں حصوں یعنی جج صاحبان اور وکلاء سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی موجودہ جدوجہد بالکل حق اور درست ہے، لیکن اس کے موثر اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ معروضی صورت حال اور مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے حقیقی اسباب اور عوامل کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور ان کے تدارک کے لیے بھی کوئی ٹھوس صورت اختیار کی جائے۔

دوسرے نمبر پر ہم اس امر کے بارے میں اپنے تحفظات کو ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں کہ ملک کے نئے قائم مقام چیف جسٹس محترم رانا بھگوان داس بنے ہیں اور موجودہ عدالتی بحران کے حل میں ان کے کردار کو اساسی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ہم ایک معروف قانون دان، اچھی شہرت رکھنے والے منصف اور صاحب کردار شخصیت کے طور پر ان کا احترام کرتے ہیں اور ان کے لیے دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں اس بحران میں ملک وقوم کے مفاد میں بہتر فیصلہ کرنے اور کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین، لیکن ملک کے جو دینی اور قانونی حلقے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چیف جسٹس کے منصب پر ایک غیر مسلم جج کے فائز ہونے کے اصولی جواز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، ہم ان کے شک وشبہ کو بھی بے جواز نہیں سمجھتے۔ یہ درست ہے کہ ملک کے دستور میں کسی غیر مسلم جج کے چیف جسٹس بننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یہ بات بھی بالکل بجا ہے کہ جسٹس رانا بھگوان داس دستوری اور قانونی طور پر سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بننے کا پورا استحقاق رکھتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ اس سے قبل جسٹس اے آر کارنیلیس غیر مسلم ہونے کے باوجود سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں، بلکہ ہم تو ان کے اس اعزاز وافتخار کے بھی پوری طرح معترف ہیں کہ انھوں نے ایک باکردار اور دیانت دار جج کے طور پر عدلیہ کے وقار میں اضافہ کیا اور غیر مسلم ہوتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی حلقوں میں اسلامی قانون اور اسلامی نظام عدالت کا مسلسل دفاع اور وکالت کر کے ملک کے دینی حلقوں کے دلوں میں بھی اپنے لیے جگہ بنائی، لیکن اس سب کچھ کے باوجود اصولی طور پر کسی غیر

مسلم کا ملک کی عدالت عظمیٰ کا سربراہ بننا بہرحال محل نظر ہے اور معاملہ کے اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصولی اعتراض اور بھی زیادہ قابل توجہ ہو جاتا ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کا چیف جسٹس عدالت عظمیٰ کے اس شریعت اپیلٹ بنچ کا بھی سربراہ ہوتا ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتا ہے اور جسے اسلامی احکام وقوانین کی بنیاد پر فیصلے کرنا ہوتے ہیں۔ اس صورت میں جہاں قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کا اختیار ایک غیر مسلم جج کے ہاتھ میں دے دینا شرعی اصولوں کے مطابق درست نظر نہیں آتا، وہاں ہمارے خیال میں یہ اس جج کے ساتھ بھی زیادتی ہے کہ اسے اس کے ایمان وعقیدہ کے خلاف کسی دوسرے مذہب کے مطابق، جس پر وہ یقین نہیں رکھتا، فیصلے کرنے کا پابند بنایا جائے۔

ہماری معلومات کے مطابق برطانیہ کا بادشاہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کیتھولک عیسائی نہ ہو، کیونکہ وہ ملک کا بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ چرچ آف انگلینڈ کا بھی سربراہ ہوتا ہے اور چرچ آف انگلینڈ کیتھولک نہیں ہے، اس لیے اس کا سربراہ کیتھولک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بادشاہت کے قواعد وضوابط میں یہ بات باقاعدہ طور پر شامل ہے کہ چونکہ برطانیہ کا بادشاہ چرچ کا بھی سربراہ ہوتا ہے، اس لیے اس کا تعلق کیتھولک فرقہ سے نہیں ہوگا۔ اگر اس نزاکت کا برطانیہ کے نظام میں لحاظ رکھا گیا ہے اور وہاں اس پابندی کا اہتمام ضروری سمجھا گیا ہے تو ہمارے ہاں بھی اس اصولی موقف کے احترام میں کوئی حجاب محسوس نہیں کیا جانا چاہیے، اس لیے ہم ملک کی قانون دان برادری اور دستوری حلقوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس مسئلے کو ابہام میں رہنے دینے کے بجائے اس کا کوئی حل ضرور نکالیں گے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان اور اس کی عدالت عظمیٰ کے اسلامی تشخص کو اس حوالے سے شکوک وشبہات کے دائرے سے نکالیں گے۔

ان تحفظات کے اظہار کے ساتھ ہم عدلیہ کے وقار اور بالادستی کے تحفظ کے لیے وکلاء برادری کی جدوجہد اور مطالبات کی حمایت کرتے ہیں، ان کے ساتھ بھرپور یک جہتی اور ہم آہنگی کا اظہار کرتے ہیں اور دستور کی بالادستی، عدلیہ کے وقار واحترام اور اصول وقانون کی حکمرانی کی اس جدوجہد کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، اپریل ۲۰۰۷ء)

جسٹس افتخار محمد چودھری کا تاریخی خطاب

لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے اجتماع سے چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کا خطاب میں نے لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا عیسیٰ منصوری کے گھر بیٹھ کر سنا ہے۔ مجھے ۵ رمئی کو لاہور سے لندن کے لیے سفر کرنا تھا۔ اسی روز جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب کے لاہور ہائی کورٹ بار سے خطاب کی خبر اخبارات میں پڑھی تو دو حوالوں سے تشویش ہوئی۔ ایک اس حوالہ سے کہ جب وہ گوجرانوالہ سے گزریں گے تو میں ان کے استقبال میں شریک نہیں ہو سکوں گا اور دوسری یہ کہ اس روز لاہور کی کیا صورت حال ہو گی اور کیا میں ایئرپورٹ پہنچ سکوں گا؟ بہت سے دوستوں نے مشورہ دیا کہ ۴ رمئی کو جمعہ پڑھا کر لاہور چلا جاؤں اور ہفتہ کے روز لاہور کے سفر کا رسک نہ لوں۔ میں نے بھی ایک بار ارادہ کر لیا، مگر پھر خیال آیا کہ چیف جسٹس نے صبح ساڑھے سات بجے اسلام آباد سے روانہ ہونا ہے اور مجھے سات بجے تک ایئرپورٹ پہنچنا ہے، کیونکہ دس بجے میری ہیتھرو کے لیے پی آئی اے کی پرواز ہے، اس لیے شاید اتنی صبح پولیس اپنی ''روایتی کارروائیاں'' شروع نہ کرے۔ اسی تذبذب کی کیفیت میں مغرب کے بعد کسی کام کے لیے لاہوری دروازے تک گیا تو ہمارے پڑوسی تھانہ کوتوالی کے ایک آفیسر راستہ میں مل گئے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ یار! کل کس وقت آپ لوگوں نے اپنے ''کام کاج'' کا آغاز کرنا ہے، اس لیے کہ مجھے صبح ایئرپورٹ جانا ہے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ صبح سویرے نکل جائیں، اس لیے کہ بعد میں حالات شاید ٹھیک نہ رہیں۔ مذکورہ پولیس آفیسر سے میری بات اتفاقاً راہ چلتے ہو گئی تھی، لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید میں لاہور جانے کے لیے تھانہ والوں سے این او سی لے رہا ہوں۔

بہر حال میں صبح نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی روانہ ہو کر سات بجے سے پہلے اطمینان کے ساتھ لاہور ایئر پورٹ پہنچ گیا اور جب پی آئی اے کا طیارہ سوا دس بجے لاہور سے روانہ ہو کر کم وبیش سوا آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر اترا تو وہاں کے وقت کے مطابق دن کے اڑھائی بج رہے تھے۔ اس بار خلاف معمول ایئر پورٹ سے باہر آنے میں خاصی دیر لگ گئی۔ رش بہت زیادہ تھا، امیگریشن کا عملہ کم تھا اور رفتار بہت سست تھی۔ اس سے قبل ہیتھرو ایئر پورٹ پر ایسا تجربہ کبھی نہیں ہوا، جبکہ میں کم وبیش بائیس سال سے مسلسل لندن آ رہا ہوں۔ ایئر پورٹ سے باہر نکل کر ساؤتھ آل کی ابوبکر مسجد میں پہنچا تو ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ جلدی جلدی ظہر کی نماز ادا کی کہ اس کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ اتنے میں مولانا عیسیٰ منصوری کا فون آ گیا کہ بھئی کہاں پہنچے ہو؟ ٹی وی پر آپ کے چیف جسٹس کا جگہ جگہ استقبال مسلسل دکھایا جا رہا ہے اور اس وقت وہ گوجرانوالہ میں ہیں۔ انہوں نے ایک دوست کو فون کیا کہ وہ مجھے جتنی جلدی ہو سکے، ان کے گھر پہنچائیں تاکہ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر یہ مناظر دیکھ سکوں۔ ساؤتھ آل سے وائٹ چیپل میں مولانا منصوری کے گھر تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا، لیکن جسٹس افتخار محمد چودھری ابھی گوجرانوالہ ہی میں تھے اور مولانا منصوری سارے کام کاج چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے براجمان تھے۔ وہ ساتھ ساتھ اپنے مخصوص انداز میں کمنٹری بھی کرتے جا رہے تھے۔ مسلسل سفر کی تھکاوٹ کے باوجود میں ان کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھا رہا اور جسٹس افتخار محمد چودھری کے والہانہ استقبال کا اسکرین پر مختلف چینلوں کے حوالے سے مشاہدہ کرتا رہا۔ البتہ جب چیف جسٹس کا قافلہ کامونکی سے گزر گیا تو میں نے مولانا منصوری سے گزارش کی کہ اب مجھے کھانا کھلائیں اور اجازت دیں کہ میں نماز عشا ادا کر کے سو جاؤں، اس لیے کہ تھکاوٹ اور نیند کے غلبے کے باعث اب زیادہ بیٹھنا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

میرا خیال تھا کہ سونے کے بعد فجر کے لیے اٹھوں گا تو سارے مراحل گزر چکے ہوں گے اور نیوز میں ان کی جھلکیاں دیکھ لوں گا، لیکن صبح بیدار ہوا تو منصوری صاحب نے، جو رات بھر ٹی وی کے سامنے رہے، کہا کہ جسٹس صاحب ابھی لاہور پہنچے ہیں اور اجتماع سے خطاب کرنے والے ہیں، اس لیے جلدی سے نماز پڑھ کر میرے کمرے میں آ جاؤ۔ اب پھر میں مولانا

منصوری کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور زندہ دلان لاہور کی زندہ دلی کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ الیکٹرانک میڈیا کا کمال ہے کہ لاہور سے ہزاروں میل دور لندن میں بیٹھا اس جلسے کی کارروائی یوں دیکھ اور سن رہا تھا جیسے میں خود اس میں موجود ہوں اور اس میں حصہ لے رہا ہوں۔ میں نے لاہور ہائی کورٹ بار کے صدر جناب احسن بھون اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکیل چودھری اعتزاز احسن کے خطابات لفظ بہ لفظ سنے۔ انہوں نے جو کچھ کہا، وہ صرف ان کے اور وکلاء برادری کے جذبات کی ترجمانی نہیں تھی بلکہ وہ پوری قوم کے اجتماعی احساسات کی عکاسی کر رہے تھے۔ خصوصی طور پر چودھری اعتزاز احسن کے مختصر خطاب سے یہ محسوس ہوا کہ وہ بطور خاص میرے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ میں وکیل نہیں ہوں، اس موقع پر لاہور میں ہوتا تو بھی میرے لیے اس میں شرکت کا کوئی موقع نہیں تھا، لیکن چودھری اعتزاز احسن کا خطاب سنتے ہوئے میرے دل میں یہ احساس ابھر رہا تھا کہ اگر مجھے اس اجتماع کے سامنے اظہار خیال کا موقع ملتا تو میں بھی ایک ''مولوی'' کی حیثیت سے وہی کچھ کہتا جو ''وکیل'' کی حیثیت سے چودھری اعتزاز احسن نے کہا ہے، چنانچہ میں دل ہی دل میں اس خطاب پر چودھری اعتزاز احسن کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی بحالی کی اس جدوجہد میں جسٹس افتخار محمد چودھری اپنی منصبی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی تقاضوں کی تکمیل کی طرف جس حوصلے اور تدبر کے ساتھ پیش قدمی کر رہے ہیں اور جس طرف ملک بھر کی وکلاء برادری، بنچ اور بار کے دونوں فورموں سے ان کا ساتھ دے رہی ہے، وہ میرے جیسے پرانے سیاسی کارکنوں کے لیے تو ایک خوبصورت خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کرے کہ اس کی عملی تعبیر بھی جلد دیکھنے کو مل جائے، آمین یا رب العالمین۔ چیف جسٹس جناب افتخار محمد چودھری نے اپنے اس تاریخی خطاب میں انسانی حقوق کے حوالے سے سپریم کورٹ کے کردار کو موضوع گفتگو بنایا۔ چونکہ یہ میرا دل پسند موضوع ہے، اس لیے ظاہر ہے پوری توجہ سے سنا۔ انہوں نے اپنے چیف جسٹس کا منصب سنبھالنے کے بعد اس سلسلے میں عدالت عظمیٰ کی جس عملی پیش رفت کا ذکر کیا، وہ ہم سب کے سامنے ہے اور پوری قوم اس کی معترف اور شکر گزار ہے، لیکن میرے لیے چیف جسٹس کے

خطاب کا جو حصہ سب سے زیادہ دلچسپی، اطمینان اور خوشی کا باعث ہوا، وہ ''قرارداد مقاصد'' کے حوالے سے بنیادی انسانی حقوق کا تذکرہ اور ان کی تشریح ہے۔ گویا انہوں نے اس ''قومی کمٹمنٹ'' کا اعادہ کیا ہے کہ بنیادی انسانی حقوق کی تعبیر و تشریح میں اسلام اور قرآن و سنت کو بنیاد کا درجہ حاصل ہے اور میرے جیسے ''خالص مولوی'' کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کون سی ہو سکتی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک چودھری اعتزاز احسن کے خطاب میں بنچ اور بار کو مولوی تمیز الدین مرحوم کیس سے ظفر علی شاہ کیس تک کی آئینی پٹیشنوں کی یاد دہانی اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے تاریخی خطاب میں بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے قرآن و سنت کا ایک بنیاد کے طور پر تذکرہ اس ساری تقریب کا ماحصل ہے، کیونکہ یہی دو بنیادیں ہیں جن کے عملی احترام کا اہتمام ہو جائے تو وطن خداداد پاکستان کے صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ ہونے کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

چیف جسٹس محترم نے اپنے خطاب میں ان طبقات کا ذکر کیا جو خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ یہ صرف چند طبقات کی بات نہیں، بلکہ کم و بیش ہر طبقے میں ہمارے ہاں ایسے افراد موجود رہتے ہیں جو قانون سے بالاتری کو اپنا استحقاق تصور کرتے ہیں اور قانون کی پابندی ان کے نزدیک اپنے مقام و مرتبے کو کم کرنے کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری نے ایسے طبقات اور افراد کو قانون کے دائرے میں لانے کے عزم کا اظہار کیا ہے جو بہت مبارک ہے۔ اگر وہ ایسا ماحول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک بہت بڑا قومی معرکہ سر کرنے پر ان کا نام تاریخ کے ایک روشن باب کا عنوان بن جائے گا۔ آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی اس مہم کی قیادت اگرچہ وکلاء برادری کر رہی ہے، لیکن یہ صرف وکلاء کی جدوجہد نہیں، بلکہ پوری قوم اس جدوجہد میں ان کے ساتھ شریک ہے جس کا عملی اظہار چیف جسٹس آف پاکستان کے اسلام آباد سے لاہور تک کے پچیس گھنٹے کے سفر میں بخوبی ہو گیا ہے اور امید قائم ہونے لگی ہے کہ پاکستانی قوم آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی منزل حاصل کرنے میں ان شاء اللہ العزیز جلد کامیاب ہو جائے گی۔

خدا جانے ٹی وی چینلز پر لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی اس تقریب کے مناظر دیکھتے ہوئے ''لال مسجد'' کیوں بار بار یاد آتی رہی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ لاہور ہائی کورٹ کا ماحول دیکھتے ہوئے لال مسجد کے مینار آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی ایک مورچہ ہے جس کا عنوان اسلام کی بالادستی ہے اور اس مورچے کے لیے صف بندی کرنے والوں کا عزم یہ ہے کہ معاشرے کو اسلامی احکام کی کھلے بندوں نافرمانی سے پاک کیا جائے اور اسلامی احکام و روایات کی عمل داری کو یقینی بنایا جائے۔ یہ مورچہ بھی کمزور نہیں ہے اور اگر اسے ڈھنگ سے منظّم کیا جاتا تو لاہور ہائی کورٹ کے اس مورچے سے کہیں زیادہ دل کش اور حوصلہ پر ور مناظر دیکھنے میں آتے، لیکن حکمت و تدبر کے فقدان نے اسے قوم کے جذبات کی ترجمانی اور اظہار کا سب سے بڑا مورچہ نہیں بننے دیا جس کا کم از کم مجھے تو بہت افسوس اور صدمہ ہے۔ اگر ''لال مسجد'' کے دوست زیادہ ناراض نہ ہوں تو ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور ہائی کورٹ بار کے اس مورچے کی کامیاب پیش رفت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے ایک شخصیت یا ادارے کا مسئلہ بنائے رکھنے کی بجائے ملک بھر کی وکلاء برادری کا مشترکہ مسئلہ بنایا، بنچ اور بار دونوں کو اعتماد میں لیا، ملک گیر مشاورت کا نظام قائم کیا، بڑوں کی سنیارٹی کا احترام کیا، جوش و جذبے کا تعلق حکمت و تدبر کے ساتھ قائم رکھا اور شخصی فیصلوں اور اقدامات کی بجائے اجتماعیت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے وہ آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی مہم کو قومی تحریک کی شکل دینے میں کامیاب نظر آ رہے ہیں۔ اگر ''لال مسجد'' بھی اسی طرح حکمت و تدبر کا راستہ اختیار کرتی اور اسلامی قوانین و احکام کی عمل داری، منکرات و فواحش کے سد باب اور مساجد کے تحفظ کی مقدس مہم کو صحیح رخ پر آگے بڑھانے کی کوئی صورت پیدا کر لیتی تو یہ ملک و قوم کے بہتر مستقبل کے لیے ایک مفید اور موثر تحریک ثابت ہوتی، لیکن ابھی تو ایسا لگتا ہے کہ اس معاملے میں ''وکیل'' بازی جیت رہا ہے اور مولوی کو ابھی تک شخصی دائروں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔

(روزنامہ پاکستان، ۸ مئی ۲۰۰۷ء)

چیف جسٹس کی بحالی اور قوم کی توقعات

چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کی خبر سن کر مجھے یوں لگا جیسے کوئی ڈاکٹر ایمرجنسی آپریشن روم کے دروازے سے باہر جھانک کر مریض کے رشتہ داروں کو یہ خوش خبری دے رہا ہے کہ مریض کی حالت خطرے سے باہر ہوگئی ہے اور اس نے اب سانس لینا شروع کر دیا ہے۔ اس فیصلے کے اعلان سے قبل پوری قوم سکتے کے عالم میں تھی اور کان اسلام آباد کی طرف لگے ہوئے تھے کہ وہاں سے کیا خبر آتی ہے؟ عدالت عظمیٰ کے فل کورٹ نے قوم کا رخ مایوسی سے امید کی طرف پھیر دیا ہے جس پر فل کورٹ کے تمام ارکان پوری قوم کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

اب سے ساٹھ برس قبل جب جنوبی ایشیا میں ''پاکستان'' کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آیا تو کچھ باتیں اس کے قیام کے ساتھ ہی قطعی طور پر طے ہوگئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس ملک میں بادشاہت یا شخصی آمریت نہیں ہوگی بلکہ جمہوری اصولوں کے مطابق ملک کی حکومت وجود میں آیا کرے گی، یہ سیکولر اور لادین ریاست نہیں ہوگی بلکہ اسلامی تعلیمات اور قرآن وسنت کے احکام کے مطابق اس کا نظام چلایا جائے گا اور اس ملک میں کسی فرد یا طبقے کی رائے مسلط ہونے کے بجائے دستور اور قانون کی حکمرانی ہوگی۔

قوم خوش تھی کہ ہم نے ایک نئی منزل کی طرف سفر شروع کیا ہے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے جس میں نہ صرف ہمارے اعتقادات وجذبات کا لحاظ رکھا جائے گا بلکہ ہماری مرضی اور رائے کو بھی پورا احترام حاصل ہوگا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قوم کی یہ امیدیں دھندلاتی چلی گئیں۔ عوام کی حکمرانی کے بجائے حکمران طبقات وجود میں آ گئے اور دستور قانون کو

اسٹیبلشمنٹ کی آکاس بیل نے ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ ملک کو دستور فراہم کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی اپنے کام میں مصروف تھی کہ طبقاتی کشمکش کی بھینٹ چڑھ گئی اور جب دستور ساز اسمبلی نے انصاف کے لیے عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی دادرسی کے بجائے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا گیا۔ فوجی طالع آزماؤں کی ہوس اقتدار کے حوالے سے عدالت عظمیٰ ہی کی طرف سے قوم کو ''نظریہ ضرورت'' کا تحفہ ملا جس کا مطلب رفتہ رفتہ یہ سمجھ میں آیا کہ قوم کی اجتماعی ضروریات کی باگ ڈور چند افراد یا طبقوں کے ہاتھ میں ہوگی جو کسی بھی وقت ان کا رخ کسی طرف بھی موڑ سکیں گے۔ تب سے قوم وملک اور قوم کے اجتماعی مفادات وضروریات چند طبقات کے ہاتھوں میں یرغمال ہیں اور قوم اپنے وطن عزیز میں دستور وقانون کی حکمرانی کے راستے تلاش کرتے کرتے تھک گئی ہے۔

۱۹۷۳ء کا دستور آیا تو امید کی ایک کرن روشن ہوئی کہ یہ پوری قوم کا متفقہ دستور ہے جس میں اسلام بھی ہے، جمہوریت بھی ہے، انسانی حقوق بھی ہیں اور قانون کی حکمرانی کی ضمانت بھی ہے مگر وہ بھی ''نظریہ ضرورت'' کی کرم فرمائی سے نہ بچا، کئی بار دم توڑتے ہوئے دوبارہ زندگی کی نعمت سے بہرہ ور ہوا مگر مسلسل کومے کی حالت میں ہے اور اب سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے کچھ امید ہونے لگی ہے کہ یہ جاں بلب مریض شاید ہوش میں آکر باتیں کرنے لگے اور اپنا معمول کا کردار ادا کرنے کے لیے چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو جائے۔

جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے اوپر استعفے کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے جب ریفرنس میں عائد کیے جانے والے الزامات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا تو پوری قوم جھوم اٹھی تھی کہ ''چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے'' کے ماحول میں کسی نے تو سر اٹھا کر چلنے کی بات کی، کوئی تو ایسا آیا جس نے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ یہ ادا قوم کو ایسی پسند آئی کہ چیف جسٹس کے ساتھ ہی سڑکوں پر نکل آئی اور اس وقت تک واپس جانے سے انکار کر دیا جب تک جسٹس افتخار محمد چودھری چیف جسٹس کے چیمبر میں واپس جا کر اپنے فرائض ادا کرنا شروع نہیں کر دیتے۔

اس قوم کا عجیب مزاج ہے کہ اسے سر نہ جھکانے والے ہی ہمیشہ پسند آئے ہیں۔ وہ جبر

وظلم کے مقابلے میں خود کچھ کر سکے یا نہیں، مگر سر اٹھا کر چلنے والوں پر اس نے ہمیشہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا ہے۔اس کی تاریخ میں سر نہ جھکانے والے ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر بادشاہ کے دربار میں کوئی بھی سر جھکائے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے کج کلاہوں کو اس کے دربار میں جانے کے لیے جھکتے ہوئے اپنی دستاریں سنبھالنا پڑتی تھیں، مگر ایک مرد درویش نے یہ رسم نبھانے سے انکار کر دیا اور بادشاہ سلامت کا سامنا کرتے ہوئے سر اٹھا کر چلنے کی روایت قائم کی تو تاریخ نے اس کا نام ہمیشہ کے لیے اپنے اوراق میں ''مجدد الف ثانی'' کے نام سے ایک مستقل باب کا عنوان بنا دیا۔ جہانگیر بادشاہ کے اس دربار میں ہزاروں لوگ سر جھکا کر داخل ہوئے ہوں گے اور ان میں سے بہت سے لوگ تو اسے اپنی سعادت سمجھتے ہوئے بار بار جھکے ہوں گے مگر تاریخ کو ان میں سے دو چار کے سوا کسی کا نام یاد نہیں، البتہ ایک مرد فقیر نے جھکنے سے انکار کیا تو وہ آج بھی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے اور اقبال بھی اسے ''گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے'' کے عنوان سے خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ یہ شخصی انا کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ ان دونوں یعنی اپنے اپنے سامنے ہر کسی کو سر جھکانے پر مجبور کرنے والی اور اس کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرنے والی، دونوں شخصیتوں کی پشت پر فکر اور فلسفہ کارفرما تھا۔ جہانگیر اپنے باپ اکبر بادشاہ کے ''دین الٰہی'' کی نمائندگی کر رہا تھا اور اس خود ساختہ نظام و فلسفہ کی بالادستی اس کے تمام تر درباری پروٹوکول کا عنوان تھی، جبکہ مجدد الف ثانی کے ہاتھ میں اس دین محمدی کا پرچم تھا جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے ''دین الٰہی'' کا ڈھونگ رچایا گیا تھا، اس لیے یہ دو افراد کی کشمکش نہیں تھی بلکہ دو فلسفوں کی جنگ تھی اور دو عقیدتوں کا معرکہ تھا اور تاریخ ہی کا کہنا ہے کہ جب مجدد الف ثانی نے گردن جھکانے سے انکار کیا تو وہی اکبر کے دین الٰہی کے لیے ''ریٹرن پوائنٹ'' ثابت ہوا اور ایک مرد فقیر کی گردن نہ جھکانے کی یہ روایت دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے بالآخر اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شکل اختیار کر گئی۔

مجھے ایک صحافی دوست نے گزشتہ روز چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا تو میں نے عرض کیا کہ ایک مدت کے بعد کوئی خوشی کی خبر سنی ہے۔ انھوں نے

سوال کیا کہ کیا یہ کوئی ''پرسنیلٹی کلیش'' تو نہیں تھا جس پر پوری قوم بلاوجہ خوشیاں منا رہی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، مجھے ایسا نہیں لگتا، اس لیے کہ اگر خدانخواستہ ابتدا میں یہ کوئی ''پرسنیلٹی کلیش'' تھا بھی تو جس انداز سے یہ آگے بڑھا ہے، جس جذبے کے ساتھ ملک بھر کی وکلاء برادری اپنے چیف جسٹس کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے اور جس طرح والہانہ طور پر پوری قوم نے چیف جسٹس کے اس کردار کا خیر مقدم کیا ہے، اس کے بعد اب یہ سارا کچھ پوری قوم کی مشترکہ ملکیت میں چلا گیا ہے اور ''پبلک پراپرٹی'' بن گیا ہے، اسے اب کسی شخصی دائرے کی طرف واپس لے جانا ممکن ہی نہیں رہا۔

اس انٹرویو میں مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ لوگ لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ کے معاملات کو اب سپریم کورٹ میں لے جانا پسند کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس لیے کہ لال مسجد کا معاملہ پہلے سے سپریم کورٹ کی میز پر موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اپنے فرائض دوبارہ سنبھالتے ہی سب سے پہلے اس کا نوٹس لیں گے، چنانچہ آج صبح میں نے خبر پڑھ لی ہے کہ چیف جسٹس نے جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے معاملات کو ڈیل کرنے کے لیے تین رکن فل بنچ مقرر کر دیا ہے۔

بہرحال اس پس منظر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی صرف ان کی بحالی نہیں ہے بلکہ عدلیہ کی بالادستی کی بحالی ہے اور دستور و قانون کی حکمرانی کی بحالی ہے جس پر چیف جسٹس موصوف، ان کا بھرپور ساتھ دینے والی وکلاء برادری اور ان کی حمایت کرنے والی دینی و سیاسی جماعتیں بلکہ پوری قوم مبارک باد کی مستحق ہے۔ اب قوم کی امیدوں کا رخ سپریم کورٹ کی طرف ہے اور عوام اپنے دکھوں، محرومیوں اور مجبوریوں کے مداوا کے لیے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کی ٹیم کی طرف دیکھ رہے ہیں اور یہ سوال بھی ابھی موجود ہے کہ چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیے جانے سے لے کر ان کی بحالی تک جو کچھ ہوا، وہ کسی ''پرسنیلٹی کلیش'' کا نتیجہ تھا یا دو فکروں اور فلسفوں کی کشمکش تھی۔ چیف جسٹس کے پاس ابھی بہت وقت ہے اور ان کی ٹیم بھی بہت اچھی نظر آ رہی ہے، اس لیے اس سوال کا جواب وہی دیں گے اور یہ بات بھی تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ اسی عدالت عظمیٰ کے ایک سابق سربراہ سے کسی مسئلے

کے بارے میں عوامی فورم پر سوال پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ :

''جج اپنے فیصلوں میں بولا کرتے ہیں۔''

(روزنامہ پاکستان، ۲۶ جولائی ۲۰۰۷ء)

وکلاء تحریک کے قائدین کی خدمت میں چند معروضات

چودھری اعتزاز احسن صاحب ہمارے ملک کے نامور وکلاء اور معروف سیاست دانوں میں سے ہیں اور قومی حلقوں میں ان کا تعارف ایک شریف النفس، شائستہ اور دانش وراہ نما کے طور پر ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری جب دستور کی بالادستی اور عدلیہ کے وقار کی بحالی کے لیے میدان میں آئے تو ان کے قریبی رفیق کار کے طور پر مسلسل ان کا ساتھ دے کر چودھری اعتزاز احسن نے اپنی عزت میں مزید اضافہ کیا اور اسی کے نتیجے میں انھیں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کا صدر چن کر ملک بھر کے وکلاء نے دستور کی بحالی اور عدلیہ کی بالادستی کے لیے اپنی تحریک کی قیادت سونپ دی ہے جو فی الواقع ایک بڑے اعزاز کی بات ہے اور ہم اس پر چودھری صاحب موصوف کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں دستور پاکستان کی بحالی اور عدلیہ کی بالادستی کی ایک تحریک میں سرخ روئی اور کامیابی سے ہمکنار کریں، آمین یارب العالمین۔

وکلاء اس تحریک کے لیے کئی ماہ سے میدان عمل میں ہیں اور عدالتوں کے بائیکاٹ، عوامی مظاہروں اور عام انتخابات کے بائیکاٹ کی صورت میں دستور کی بحالی اور پی سی او کے تحت حلف نہ اٹھانے والے محترم جج صاحبان کی ان کے دستوری مناصب پر واپسی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جس میں ملک کا ہر باشعور شہری ان کے ساتھ ہے۔ چودھری اعتزاز احسن ایمرجنسی اور پی سی او کے نفاذ کے بعد سے مسلسل زیر حراست ہیں اور انھیں اس بات سے روکنے کے لیے کوشش کی جارہی ہے کہ وہ وکلاء کی اس تحریک کی عملاً قیادت کریں، چنانچہ بظاہر ایمرجنسی ختم ہو جانے کے باوجود ان کی حراست کا تسلسل جاری ہے مگر وہ اپنے عزم پر قائم نظر آتے ہیں جس کا

اظہار انھوں نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنی ''عارضی رہائی'' کے دوران یہ کہہ کر کیا ہے کہ ۸؍جنوری کے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی حکومت کو اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی بحالی کے لیے تین ہفتوں کا وقت دیا جائے گا اور اگر اس وقت تک چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کے ساتھی ججوں کو بحال نہ کیا گیا تو حکومت کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیا جائے گا۔

ہم چودھری اعتزاز احسن صاحب کے اس عزم اور اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دستور کی بالادستی اور عدلیہ کے محترم ججوں کی بحالی کے لیے وکلاء کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اسی حوالے سے ہم دو گزارشات وکلاء کی اس تحریک کی قیادت، بالخصوص چودھری اعتزاز احسن صاحب کی خدمت میں پیش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک یہ کہ قوم کے دوسرے طبقات کو ساتھ لیے بغیر صرف وکلاء کے فورم پر اس تحریک کو منظّم کرنے اور آگے بڑھانے کی حکمت عملی ہمارے نزدیک محل نظر ہے، اصولاً بھی کہ جب یہ قومی مسئلہ ہے تو اس کے لیے منظّم کی جانے والی تحریک میں قوم کے تمام طبقات کی نمائندگی نظر آنی چاہیے اور عملاً بھی کہ کسی ایک طبقے کی بنیاد پر چلائی جانے والی تحریک کی کامیابی کے امکانات ہمارے خیال میں زیادہ روشن دکھائی نہیں دیتے، اس لیے سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن اس تحریک کی قیادت اور کنٹرول بے شک اپنے ہاتھ میں رکھے لیکن اس میں ملک کے دینی وسیاسی حلقوں کی نمائندگی کا اہتمام ضرور کرے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ کے تمام تر احترام کے باوجود اس کے ساٹھ سالہ مجموعی کردار کے بارے میں ملک کے عوام اور مختلف طبقات کو جو شکایات ہیں اور ان کے جو تحفظات ہیں، تحریک کے اہداف طے کرتے وقت ان سب کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور اسی صورت میں اس تحریک کو پوری قوم کی حمایت حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً ملک کے جمہوری حلقوں کا شکوہ ہے کہ جسٹس محمد منیر مرحوم نے دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے کے غیر جمہوری عمل کو جواز کی جو سند بخشی تھی، اسے اس کے بعد روایت ہی کا درجہ دے دیا گیا ہے اور اب تک ہر آمر کے دستور شکن اقدامات کو ''عدالتی تحفظ'' مل رہا ہے۔ یہ صورت حال ملک کے ہر شہری کے لیے پریشان کن اور باعث اضطراب ہے اور وکلاء کی موجودہ دستوری جدوجہد بھی اسی کا فطری ردعمل

ہے۔ اسی طرح ملک کے دینی حلقوں کو بھی شکایت ہے کہ ملک میں اسلامی نظام وقوانین کی عمل داری کے لیے، جسے قیام پاکستان کا اہم ترین مقصد ہونے کے ساتھ ساتھ دستور پاکستان کی بنیاد اور اس کی طرف سے فراہم کی گئی ضمانت کا درجہ حاصل ہے، عدالت عظمیٰ کا اب تک کا مجموعی رول حوصلہ افزائی کا نہیں ہے اور جس طرح جمہوری اقدار کی سربلندی کے خواہاں حلقوں کو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی طرف سے اب تک وہ ''ریلیف'' نہیں ملا جو جمہوریت کی عمل داری کے لیے ضروری ہے، اسی طرح اسلامی اقدار کی بالادستی کے لیے بھی قوم اسی طرح عدالت عظمیٰ کی طرف سے دیے جانے والے ''ریلیف'' کا انتظار کر رہی ہے اور اس کا یہ انتظار اب رفتہ رفتہ حسرت میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام اور جمہوریت دونوں ملک کی نظریاتی اساس ہیں۔ دستور پاکستان کی بنیاد بھی انھی دو اصولوں پر رکھی گئی ہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ یہ بات دستور میں ہمیشہ کے لیے طے کر دی گئی ہے کہ ملک میں حکومت کا حق عوام کے منتخب نمائندوں کو ہوگا اور پارلیمنٹ کو ہی قانون سازی کا اختیار حاصل ہوگا، لیکن وہ قرآن وسنت کے اصولوں کی پابند اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی ذمہ دار ہوگی۔ اس لیے جہاں جمہوری اقدار کی سربلندی کا اہتمام کرنا اعلیٰ عدالتوں کی ذمہ داری ہے، وہاں اسلامی اصولوں کی بالادستی کا خیال رکھنا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے، لیکن اب تک کی معروضی صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مجموعی عدالتی کردار میں اسلام اور جمہوریت دونوں سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔

ملک کے دینی حلقوں کا عمومی تاثر یہ ہے کہ ۱۔ قرارداد مقاصد کی بالادستی کو تسلیم نہ کرنے کا عدالتی فیصلہ، ۲۔ سود کے خاتمہ کے لیے شریعت کورٹ کے فیصلے کا تعطل، اور ۳۔ صوبہ سرحد میں حسبہ ایکٹ کے نفاذ کو عدالتی طور پر روک دینے کا عمل اپنے نتائج وثمرات کے حوالے سے جسٹس محمد منیر مرحوم کے اس فیصلے سے مختلف نہیں ہے جسے کے ذریعے انھوں نے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے غیر جمہوری اقدام کو ''نظریہ ضرورت'' کا شیلٹر مہیا کر دیا تھا، بلکہ ہماری معلومات کے مطابق اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی بحالی کی تحریک کے سلسلے میں مولانا فضل الرحمٰن کا گریز کا عمل بھی حسبہ ایکٹ کے بارے میں عدالت عظمیٰ کے اس فیصلے کے پس منظر میں ہے جس کا دکھ صرف

مولانا فضل الرحمٰن کو نہیں ہے بلکہ ملک میں نفاذ اسلام کی خواہش رکھنے والا ہر شخص اس کی کسک اپنے دل میں محسوس کر رہا ہے اور اعلیٰ عدالتوں سے جسٹس محمد منیر مرحوم کے فیصلے کی طرح مذکورہ بالا فیصلوں کی تلافی کی بھی بجا طور پر توقع رکھتا ہے جس پر اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان اور ملک کے سینئر وکلاء کو پوری سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔ ہم مولانا فضل الرحمٰن کے موجودہ سیاسی کردار اور پالیسیوں کا دفاع نہیں کر رہے اور بہت سے دیگر سیاسی حلقوں کی طرح ہم بھی ان کے حوالے سے تحفظات رکھتے ہیں، البتہ ''حسبہ ایکٹ'' کے بارے میں مولانا فضل الرحمٰن کے تحفظات کو ہم بے جا نہیں سمجھتے، اس لیے اس کا ذکر ان گزارشات میں ہم نے مناسب سمجھا ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ وکلاء تحریک کی اعلیٰ قیادت اس کا ضرور جائزہ لے گی۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی قیادت، بالخصوص چودھری اعتزاز احسن صاحب کی طرف سے دستور کی بالادستی اور اعلیٰ عدالتوں کے معزول ججوں کی بحالی کے لیے تحریک کے اعلان کا ایک بار پھر خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ دستور پاکستان اور اس کی دونوں بنیادوں یعنی اسلام اور جمہوریت کی بالادستی کی اس جدوجہد میں انھیں ہمارا ہر ممکن تعاون حاصل ہوگا۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۰۸ء)

عدلیہ کی بحالی اور دستور و قانون کی بالادستی

سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر جناب اعتزاز احسن اور وکلاء تحریک کے دیگر قائدین جسٹس (ر) طارق محمود اور جناب علی احمد کرد دوبارہ نظر بند کر دیے گئے ہیں اور اس سے ایک بار پھر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ صدر پرویز مشرف اور ان کی حکومت دستور کی بالادستی اور پی سی او کے تحت معزول کیے جانے والے معزز جج صاحبان کی بحالی کے بارے میں ملک بھر کے قانون دانوں اور رائے عامہ کی بات پر توجہ دینے کے لیے ابھی تک تیار نہیں ہے، لیکن کیا اس طرح وکلاء کی قیادت کو ان سے دور رکھ کر اس تحریک کو دبایا جا سکے گا؟ ہمارے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے اور دستور کی بالادستی کی یہ جدوجہد نہ صرف یہ کہ جاری رہے گی بلکہ اس میں دن بدن شدت پیدا ہوگی۔ اس سلسلے میں عوام کے مختلف طبقوں کے جذبات کیا ہیں؟ اس سلسلے میں مزید کچھ عرض کرنے سے پہلے ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

گزشتہ ہفتہ کے دوران جہاں ریٹائرڈ جج صاحبان نے باقاعدہ اجلاس کر کے صدر پرویز مشرف کی حکومت کو چارج شیٹ کیا ہے، وہاں ملک کے تیس کے لگ بھگ سرکردہ علمائے کرام نے بھی، جن کا عملی سیاست اور اقتدار کی کشمکش سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن میں مختلف مکاتب فکر کے اکابر علمائے کرام شامل ہیں، ایک متفقہ اعلامیہ کی صورت میں ملک کی موجودہ صورت حال کے بارے میں اپنی دوٹوک رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ اس اعلامیہ پر میں نے بھی دستخط کیے ہیں اور اسی کالم میں یکم فروری کی اشاعت میں اسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے، لیکن اعلامیہ کا جو مسودہ میں نے اپنے کالم میں پیش کیا ہے، اس میں اور حتمی طور پر جاری ہونے والے اعلامیہ میں تھوڑا فرق ہے جس کی نشان دہی میرے خیال میں ضروری ہے۔

میرے پاس توثیق کے لیے جو مسودہ بھیجا گیا تھا، میں نے اسے ہی کالم کی شکل میں ''پاکستان'' کو فیکس کر دیا۔ اس میں عدلیہ کی بحالی کے بارے میں اگرچہ اصولی طور پر بات کہہ دی گئی تھی جس سے میں متفق ضرور تھا لیکن پوری طرح مطمئن نہیں تھا اور اس سے زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ موقف کا اظہار چاہتا تھا، لیکن اس اعلامیہ کے جاری ہونے میں مزید تاخیر بھی میرے نزدیک مناسب نہیں تھی، اس لیے اسی پر اکتفا کر لیا۔ مگر کراچی سے جو حتمی اعلامیہ جاری ہوا، اس میں میرے کہے بغیر لیکن میری خواہش کے مطابق موقف کو مزید واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ دونوں مسودوں کی عبارت پیش کر رہا ہوں تاکہ قارئین اس سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔

ہمارے اس کالم میں شائع ہونے والے مسودے میں عدلیہ کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ موجودہ تہہ در تہہ بحرانوں کے حل کے لیے ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ عدلیہ کو فعال کیا جائے، عدلیہ پر عوام کا اعتماد بحال کیا جائے تاکہ لوگ سڑکوں پر انصاف کے حصول کی کوشش کے بجائے عدلیہ میں فریاد رسی کر کے حقیقی انصاف حاصل کر سکیں۔ ہماری یہ بھی رائے ہے کہ جملہ ماورائے آئین اقدامات کو منسوخ کیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے صدر پرویز مشرف کو ملک وملت کی خاطر مستعفی بھی ہونا پڑے تو اس سے گریز نہ کریں۔ یہ ایک باوقار طریقہ ہوگا جس کا اس منصب کے شایان شان راستہ یہ ہے کہ وہ آئین کے مطابق صدارت کا منصب سینٹ کے چیئرمین کے حوالے کر دیں۔''

جبکہ حتمی طور پر جاری ہونے والے مسودہ میں یہ عبارت اس طرح ہے کہ:

''موجودہ بحرانوں کے حل کے لیے ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ عدلیہ کو آئین کے تقاضوں کے مطابق بحال کر کے جملہ ماورائے آئین اقدامات کو منسوخ کیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے مناسب یہی ہے کہ صدر پرویز مشرف ملک وملت کی خاطر مستعفی ہو جائیں۔ یہ ان کے لیے ایک باوقار طریقہ ہوگا۔ وہ آئین کے مطابق صدارت کا منصب سینٹ کے چیئرمین کے حوالے کریں اور وہ تمام سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لے کر معینہ تاریخ کو شفاف انتخابات کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیں۔''

یہ عبارت زیادہ واضح اور دوٹوک ہے اور ابہام کا جو خیال پہلے مسودہ سے پیدا ہو گیا تھا، وہ اب دور ہو گیا ہے۔ آج ہی ایک اخبار نویس دوست نے فون کر کے مجھ سے اس اعلامیہ کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ سرکردہ علماے کرام کی متفقہ رائے ہے اور میرے خیال میں ریٹائرڈ جج صاحبان، وکلاء برادری اور اکابر علماے کرام کی طرف سے صدر پرویز مشرف سے اقتدار چھوڑ دینے کے اس مطالبہ یا مشورہ کے بعد اس موقف کو قوم کے کم وبیش اجماعی موقف کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے کہ حالات جس قدر بگڑ چکے ہیں اور ان میں خرابی اور اس کے ساتھ ساتھ بے اعتمادی کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے، اس کے پیش نظر صدر پرویز مشرف اگر اصلاح احوال کے لیے کچھ کرنا بھی چاہیں تو وہ موثر نہیں ہوگا اور ان کا کوئی اقدام ان حلقوں کا اعتماد حاصل نہیں کر پائے گا، اس لیے اب اس کے سوا کوئی آپشن قومی سطح پر قبولیت حاصل نہیں کر سکے گا کہ صورت حال میں بنیادی تبدیلی دکھائی دے اور ایسی کوئی تبدیلی صدر پرویز مشرف کی موجودگی میں ممکن نہیں رہی۔

اس وضاحت کے بعد اب پھر ہم وکلاء تحریک کی طرف واپس آتے ہیں۔ گزشتہ روز گوجرانوالہ کے ایک بازار سے گزرتے ہوئے ایک دوست کی دکان پر رکھا تو انھوں نے سوال کیا کہ ملکی حالات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے حالات بہتری کی طرف جاتے نظر نہیں آتے۔ انھوں نے دوسرا سوال کیا کہ آپ اس فضا میں کس کے ساتھ ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں تو وکلاء کے ساتھ ہوں۔ انھوں نے پوچھا کہ کیوں؟ میں نے جواب دیا: اس لیے کہ وہ دستور اور آئین کی بالادستی کی بات کر رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے سوال کیا کہ کیا پاکستان میں کوئی تحریک امریکہ کی مرضی کے بغیر اب تک چلی ہے اور کیا آپ مطمئن ہیں کہ وکلاء کی اس تحریک کے پیچھے امریکہ کی پلاننگ نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے پیش نظر صرف یہ بات ہے کہ وکلاء کا موقف درست ہے، وہ دستور کی بحالی کی بات کر رہے ہیں اور میں بھی چاہتا ہوں کہ ملک میں جو کچھ بھی ہو، دستور اور قانون کے مطابق ہو۔

یہ ایک عام دکاندار شہری کے تاثرات ہیں جو میں نے انھی کے الفاظ میں پیش کر دیے ہیں جبکہ تین چار روز قبل مجھے لاہور میں علماے کرام کی ایک محفل میں اس موضوع پر گفتگو سننے اور

کرنے کا موقع ملا۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس محفل میں کہا گیا کہ وکلاء کی تحریک میں کسی سطح پر بھی اسلام کی بات سننے میں نہیں آ رہی، جبکہ پاکستان اور اس کے دستور، دونوں کی بنیاد اسلام اور جمہوریت پر ہے مگر وکلاء کی قیادت صرف جمہوریت کی بات کر رہی ہے اور اسلام کا لفظ قیادت کی زبان پر نہیں آ رہا۔ اس محفل میں اس بات پر بھی تحفظات کا اظہار کیا گیا کہ ''سول سوسائٹی'' کے نام پر جو این جی اوز وکلاء کی اس تحریک میں دخیل ہوگئی ہیں اور پیش پیش نظر آ رہی ہیں، یہ وہی این جی اوز ہیں جو ملک میں سیکولرازم کے فروغ کے ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر این جی اوز کو صرف اس لیے بیرونی ممالک سے فنڈز ملتے ہیں تاکہ وہ پاکستان کے معاشرے میں دین سے بے زاری اور اسلامی اقدار سے بغاوت کا ماحول پیدا کریں اور ان این جی اوز کی اس قسم کی سرگرمیاں سالہا سال سے ہم اسی رخ پر دیکھ رہے ہیں۔

اس محفل میں یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ یہ ''سول سوسائٹی'' کیا چیز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مغرب میں جمہوری انقلاب کے لیے عوام کے جس ہجوم نے تحریک چلائی تھی، اسے سول سوسائٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی نقل میں ہمارے ہاں بھی عوامی اجتماع کو سول سوسائٹی کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ اس طرح کہیے کہ عوام کے جس ہجوم کا کوئی متعین نظریہ یا عقیدہ نہ ہو، وہ سول سوسائٹی کہلاتا ہے۔

اس قسم کے تحفظات کے باوجود میرے اور میرے جیسے بہت سے نظریاتی دینی کارکنوں کی ہمدردیاں بہرحال وکلاء کی تحریک کے ساتھ ہیں۔ عدلیہ کی خودمختاری کی بحالی اور دستور و قانون کی بالادستی کے لیے ان کی جدوجہد اور قربانیوں کے ہم دل سے معترف ہیں اور اسلام اور جمہوریت کی سربلندی کے لیے بارگاہ ایزدی میں اس تحریک کی جلد از جلد کامیابی کے لیے دعا گو بھی ہیں۔ آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۶ فروری ۲۰۰۸ء)